الاقرباء فاؤنڈیشن اسلام آباد

سہ ماہی **الاقرباء** اسلام آباد

(تہذیب و معاشرت، علم و ادب اور تعلیم و ثقافت کی اعلیٰ قدروں کا نقیب)

جلد نمبر ۶ شمارہ نمبر ۳ جولائی۔ستمبر ۲۰۰۳ء





## الاقرباء فاؤنڈیشن۔اسلام آباد



مکان نمبر ۴۶۴ سٹریٹ نمبر ۵۸ آئی ۸/۳ اسلام آباد

فون ۴۴۴۲۶۸۶

E-mail:alaqrebaislamabad@hotmail.com

alaqrebaislamabad@yahoo.com

# سہ ماہی الاقرباء اسلام آباد

| | |
|---|---|
| شمارہ | جولائی۔ستمبر ۲۰۰۳ء |
| ناشر | سید ناصر الدین |
| کمپوزنگ | نعیم کمپوزرز۔اسلام آباد |
| طابع | ضیاء پرنٹرز۔اسلام آباد |


## زرِتعاون

| | |
|---|---|
| فی شمارہ | ۵۰ روپے |
| سالانہ | ۲۰۰ روپے |
| بیرون ملک فی شمارہ | ۵ ڈالر/۳ پاؤنڈ |
| بیرون ملک سالانہ | ۲۰ ڈالر/۱۲ پاؤنڈ |

# مندرجات



## انشائیہ و خاکہ



## حمد و نعت



## منظوم ترجمہ



## غزلیات

## منظومات



## تبصرہ کتب



## مراسلات



## خبر نامہ الاقرباء فاؤنڈیشن

اداریہ

# ''ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرف دار نہیں''

''الاقرباء'' کے گزشتہ شمارہ (اپریل تا جون ۲۰۰۳ء) میں ''ادب اور نظریہ ضرورت'' کے زیرعنوان جو اداریہ سپرد قلم کیا گیا تھا اس پر قارئین نے بالعموم اور اہل قلم نے بالخصوص جس بصیرت افروز ردعمل کا اظہار کیا ہے وہ اس تاثر کو مزید تقویت بخشتا ہے کہ

''غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ☆

لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں''

یعنی عہد حاضر ادب میں ایسے رویوں سے مغلوب نظر آتا ہے جو تحقیق و تخلیق کی افادیت و معنویت کو پس پشت ڈال کر فکری سطحیت اور فنی و علمی سہل انگاری کے رجحانات کو پروان چڑھا رہے ہیں اور ان رویوں نے جہاں اقدار و مقدار کے لطیف امتیازات کو دھندلا کر رکھ دیا ہے وہاں ان عناصر کو مسند اقتدار بھی سونپ دی ہے جو ابلاغ و اظہار کے وسائل کی پشت پناہی کے بل پر ادب کی قلمرو کو نہ صرف اپنے تصرف میں لا چکے ہیں بلکہ ''معیار'' کے ضامن اور اجارہ دار بھی بن بیٹھے ہیں۔ زیرنظر شمارہ میں شائع ہونے والے متعدد خطوط سے بھی اسی نقطہ نظر کی تائید ہوتی ہے جن میں ہمارے فاضل مراسلہ نگاروں نے زوال پذیر اس صورت حال کا معروضی اور حقیقت پسندانہ جائزہ لیا ہے چنانچہ اس ضمن میں ایک نکتہ جو واضح ہو کر سامنے آیا ہے وہ یہ ہے کہ معاصر ادب کے تخلیق کاروں کی ایک غالب اکثریت اپنی نگارشات سے یہ تاثر دے رہی ہے کہ ماضی ان کے نزدیک ایک عہد فراموش سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا چنانچہ اس کی شکست و ریخت پر جو عمارت تعمیر کرنے کی وہ سعی فرما رہے ہیں اسے بنیادوں کا استحکام کبھی نصیب نہیں ہو سکتا اور نہ مستقبل کا امکانی تصور ان کی گرفت میں آ سکتا ہے۔

ہم گزشتہ اداریہ کے تسلسل میں یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ دو نہایت اہم عوامل اس صورت حال کے ذمہ دار نظر آتے ہیں اولاً وہ تعلیم و تربیت اور تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کا منظرنامہ جس کے زیر اثر لکھنے

---

☆ ''مستند ہے میرا فرمایا ہوا'' کے مصداق غالب ہی ''غلطیہائے مضامیں'' باندھ سکتے ہیں۔ (ادارہ)

والوں کی نئی نسل ذہنی نشوو ارتقا کے مراحل سے گزری دوئم وہ فکری ونظری بساط اور علمی وفنی استعداد جو اس کے نتیجہ میں انہیں میسر آئی۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام منظر نامہ اس سے بہت مختلف ہے جس میں پیشرو نسل کو اپنی جبلی صلاحیتیں بروئے کار لانے اور اکتساب علم وحکمت کے لامحدود ذرائع سے پوری یکسوئی کے ساتھ استفادہ کا بھرپور موقع ملا چنانچہ یہ فرق آج ان تخلیقات کا معروضی جائزہ لینے سے واضح ہو جاتا ہے جو ایک طرف Classics کے زمرے میں آتی ہیں اور جن پر قدامت ورجعت یا کلاسیکی طرز فکر کا لیبل چسپاں ہے اور دوسری طرف جدت وجدیدیت کا نام نہاد مکتب فکر قرطاس وقلم کو آلہ کار بنائے ہوئے ہے۔ ترقی پسند تحریک ادبی ارتقاء کے ایک خاص مرحلے پر ابھری اور اس نے متعدد قد آور شخصیتوں کو جنم دیا جو ہمارے ادب کا لازوال اثاثہ بن گئے لیکن اس طائفہ خیال نے کلاسیکی ادب سے نہ اغماض برتا اور نہ اس کی بنیادوں کو مسمار کرنے پر کمر بستہ ہوئے بلکہ شاعری میں خصوصاً ان فنی اقدار کا احترام کیا اور اشاریت ورمزیت کے حسن سے آراستہ روایتی استعارات وتشبیہات کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جو کلاسیکی ادب کا وقار وافتخار ہیں یہی نہیں بلکہ قدیم وجدید افکار و علامات کے استعمال سے اسلوب کے خوشنما امتزاج کی صورت میں لفظ ومعنی کو تازگی عطا کی ایسے ہی ایک کاروان رنگ وبو کے سرخیل فیض احمد فیض قرار پائے جبکہ کلاسیکی ادب جس سے قدامت ورجعت کو یکسر منفی مفہوم میں منسوب کیا جاتا ہے مختلف اصناف ادب کو کہ وہ ناول وافسانہ ہو یا نظم وغزل ایسی جید وبے مثال ہستیوں کی کہکشاں مرتب کر چکا ہے جن کی تجلی بار تخلیقات آنیوالے ہر وقت میں منارۂ نور بنی رہیں گی اس کے برخلاف جدت وجدیدیت کے نام پر جو نام نہاد ادب آج تخلیق ہو رہا ہے وہ نہ صرف فکر ونظر کی گہرائی اور گیرائی سے یکسر محروم نظر آتا ہے بلکہ اصناف ادب کی ہیئت کو بھی نامانوس گھر درے اور بے ہنگم الفاظ کے استعمال سے مسخ کرتا چلا جارہا ہے اگر ایسا نہیں تو کیا یہ ادب اپنی کوکھ سے جنم لینے والوں میں ان ہستیوں کا کوئی عشر عشیر بھی پیش کرسکتا ہے جو کلاسیکی شعر وادب کا سرمایہ افتخار ہیں اور جن کے بغیر ادب یا شعر کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اصناف سخن جنہوں نے کلاسیکی اقدار کے زیر سایہ نشوونما پائی آج ناپید ہوتی جارہی ہیں کیا واقعی رباعی جیسی جلیل وجمیل صنف سخن کا نعم البدل "ہائیکو" کو قرار دیا جاسکتا ہے جس کا ہمارے قلمکار سے نہ تو کوئی معاشرتی رشتہ ہے اور نہ جو ہمارے تہذیبی وثقافتی مزاج سے کوئی مطابقت رکھتا ہے؟ رباعی کا فن عظیم ذہنی صلاحیت، فکر ونظر کی پختگی اور فلسفہ وفن پر مضبوط گرفت کا متقاضی ہے جبکہ یہ اوصاف جدت وجدیدیت کے نام پر ابھرنے والے کسی بھی پست قامت میں نظر نہیں آتے یہی وجہ ہے کہ یہ عظیم المرتبت صنف سخن معدوم ہوتی جارہی ہے تاہم وہ

چند بزرگ جنہوں نے اپنے عہد جوانی میں اکتساب فیض کیا اور مسلسل کاوش وکوشش سے اس صنف سخن کو تمکنت وتوانائی بخشی آج اس شبستان شعر کے آخری چراغ بن کر ٹمٹمار ہے ہیں غزل کی حسین صنف سخن کا حال بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں کہ جدیدیوں نے اس کی درگت بنانے میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھار کھی یا یوں کہئے کہ غزل کی لطافت معنوی، ہمہ گیری، ثقافتی آہنگ اور فنی محاسن کو قائم و دائم رکھنے اور انہیں مزید جلا اور تازگی بخشنے کے لئے جس ذہانت فکر اور فنکارانہ ذکاوت کی ضرورت ہے وہ ان اہلیت ومطالعہ اور نفاست مذاق وعقل سلیم سے محروم لوگوں کے بس کا روگ نہیں۔ ادب میں نئے افق تلاش کرنے اور قدیم وجدید فکر کو نئے سانچوں میں ڈھالنے کا کام اور ماضی حال و مستقبل کو مربوط ومنضبط رکھنے کا دانش وحکمت پر مبنی عمل وقت کی شدید ترین ضرورت ہے لیکن یہ کام جن معدودے چند ہاتھوں کے ذریعہ انجام دینے کی مساعی کی جارہی ہیں ان کی قطع وبرید پر ایک انبوہ کم سواداں کمربستہ نظر آتا ہے اور یہی وہ ادبی مافیا ہے جو ذرائع ابلاغ پر اپنی گرفت کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کی حکمت عملی پر کارفرما ہے لہٰذا ضرورت ہے کہ ادب کے علم وحکمت اور تدبر وثقاہت کے ورثہ کی نگہبانی کرنے والی اقلیت منظم ہو کر کثرت کم نظراں کے ہاتھوں ہونے والی تباہی کو روکے اور ادبی ابلاغ کے ان گوشوں کو تقویت بہم پہنچائے جو اس ہنگام انتشار میں مقدار سے ہٹ کر اقدار کو فروغ دینے کے لئے کوشاں ہیں۔

---

ڈاکٹر جمیل جالبی

# پاکستان میں اقبال کا مستقبل

نومبر ولادت اقبال کا مہینہ ہے اور اسی مناسبت سے میں آج اس سوال کا جواب دینا چاہتا ہوں جو مجھ سے خطوط کے ذریعے اور زبانی بھی' اکثر پوچھا جاتا رہا ہے: اور وہ سوال یہ ہے کہ ہماری موجودہ فکری و تہذیبی روش' ہمارے موجودہ تہذیبی رویے' اور قومی سطح پر ہماری حکمت عملی ہمیں کہاں لے جا رہی ہے اور اکیسویں صدی میں پیغام اقبال کی ہمارے لیے کیا اہمیت ہوگی؟

اس سوال کا جواب دینے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ میں گردش نجوم کا زائچہ بناؤں یا علم جفر سے حساب لگا کر بتاؤں کہ اکیسویں صدی میں پیغام اقبال کی کیا صورت ہوگی؟ یا پھر یہ کروں کہ اقبال کی ساری تحریروں کو' جن میں شاعری بھی شامل ہے اور نثر بھی' اردو بھی شامل ہے اور فارسی و انگریزی بھی' سامنے رکھ کر یہ دیکھوں کہ اقبال نے اپنے دور کے معاشرے کو کیا پیغام دیا' اس پیغام نے اس پر کیا اثرات مرتب کیے اور اب اکیسویں صدی میں ان اثرات کی کیا نوعیت ہوگی؟ ایک اور طریقہ یہ ہے کہ پہلے فکر اقبال کی بنیادوں کو دیکھا جائے' اس تہذیب کو دیکھا جائے جس کا احیاء اقبال چاہتے تھے اور پھر یہ دیکھا جائے کہ احیاء کے اس عمل نے آج کیا صورت اختیار کی ہے اور اب عہد حاضر کے مغربی اثرات نے اس تہذیب کے بادبانوں کا رخ کس سمت موڑ دیا ہے یا موڑ رہے ہیں۔ زائچہ بنانا یا علم جفر اتفاق سے مجھے آتا نہیں ہے البتہ تہذیب اور کلچر کے مسائل سے مجھے تھوڑی بہت شد بد ضرور ہے اور فکر اقبال کے بنیادی رشتوں کی تھوڑی بہت سمجھ بوجھ بھی مجھ میں ہے یا کم از کم میں محسوس کرتا ہوں کہ ہے اس لیے بہتر طریقہ یہی ہے کہ فکر اقبال کو سمجھ کر اقبال ہی کے حوالے سے مستقبل میں جھانکنے کی کوشش کروں تاکہ کوئی صحیح صورت پیدا ہو یا اس پیغام کا آنے والے زمانے میں کچھ اندازہ کیا جا سکے۔ ایک بات میں یہاں اور کہتا چلوں کہ میں اپنی بات پاکستان تک محدود رکھوں گا یا زیادہ سے زیادہ برصغیر تک۔ بین الاقوامی باتیں ویسے بھی مجھے نہیں آتیں اور اس لیے بھی نہیں آتیں کہ میں سمجھتا ہوں کہ جس فرد کا اپنے معاشرے سے جتنا گہرا رشتہ ہوگا وہ فرد عالمی سطح پر بھی اتنا ہی مضبوط و مستحکم ہوگا۔ ہماری قوم' پیغام اقبال کے برعکس' الٹی سمت میں چل رہی ہے۔ وہ اپنے معاشرے سے تو رشتے کمزور کر رہی ہے اور ساری

توجہ بین الاقوامی رشتوں پر دے رہی ہے' نتیجہ اس کا یہ ہے کہ نہ قومی رشتے باقی رہے ہیں اور نہ بین الاقوامی رشتے یعنی دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔

پاکستان ۱۴۔اگست ۱۹۴۷ء کو وجود میں آیا تھا اور اب خیر سے پاکستان کو وجود میں آئے ۵۵ سال ہو گئے ہیں۔ان ۵۵ سالوں کی تاریخ کا میں عینی شاہد ہوں۔میں نے شعور کے ساتھ ان ۵۵ سالوں میں پاکستان کے ساتھ سفر کیا ہے اور ۳۲ سال پہلے آنسوؤں کے ساتھ پاکستان کو دو نیم ہوتے بھی دیکھا ہے۔میں نے جو کچھ اس سفر میں دیکھا اور اس سفر میں مجھ پر جو کچھ بیتی اس کا تعلق صرف آج سے نہیں بلکہ آنے والے کل سے بھی ہے جسے اقبال ''فردا'' کہتے ہیں۔پاکستان کا خواب اقبال نے دیکھا تھا اور اس خواب میں احیاء اسلام کا خواب بھی شامل تھا۔وہ ملا کا اسلام نہیں تھا بلکہ ایک ایسا آگے دیکھنے' آگے بڑھنے اور زندگی کو بحیثیت مجموعی آگے بڑھانے والا اسلام تھا جس سے تہذیب جنم لیتی ہے اور فرد کی تخلیقی قوتیں چشموں کی طرح ابلنے لگتی ہیں اقبال کا یہ خواب پورا نہیں ہوا اور وہ معاشرہ بھی وجود میں نہ آسکا جس کا بار بار ذکر اقبال کی شاعری اور ان کے خطبات میں آیا ہے۔اس عرصے میں یہ سانحہ ضرور پیش آیا کہ ہم نے اپنے اقبال کو مزار پرستوں کے حوالے کر دیا اور جیسا کہ میں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اس مزار پرست ذہن نے جھوٹے احترام کا ایک ایسا مصنوعی ہالہ اس عظیم ہستی کے گرد بنا دیا کہ اب اقبال سے بات کرتے ہوئے بھی اس لیے ڈر لگتا ہے کہ کہیں مزار اقبال کے مجاور اسے اقبال دشمنی کا نام نہ دے دیں۔اقبال نے بڑے درد و کرب کے ساتھ ان بنیادی مسائل پر غور کیا تھا جن کا تعلق دنیائے اسلام کی زندگی و موت اور مستقبل سے تھا۔اقبال کو ہم اسی طریقے سے حیات نو دے سکتے تھے جس طرح انہوں نے اپنے اسلاف کے افکار و خیالات کا تنقیدی محاکمہ کیا تھا۔صرف پھولوں کی چادر چڑھانے یا مزار اقبال پر قوالی کرانے سے ہم اقبال کو زندہ نہیں رکھ سکتے۔اقبال نے زندگی کے مسائل کے بطن کی گہرائیوں میں اتر کر سوچا تھا اور کرب تخلیق سے گزر کر نئی فکر اور نئی مسلم تہذیب کی جہت مقرر کر کے ہمیں ایک راستہ دکھایا تھا جس پر چلنا اور اسے صاف و کشادہ کرنا ہمارا فرض تھا۔اس مجاوری کا اثر یہ ہوا کہ اقبال ایک رسم بن کر رہ گئے اور ان کا اثر' جیسا کہ ہماری فکر اور ہماری تہذیب پر پڑنا چاہئے تھا وہ پڑنا بند ہو گیا اور اسی کے ساتھ ہماری بے لگام قوم فرنگی تہذیب کے جال میں اس طرح پھنس گئی کہ اب اسے وہاں سے نکالنا یقیناً پیغمبری کام ہے۔جھوٹا' یک طرفہ معیار زندگی بڑھانے کے رجحان سے پیدا ہونے والی ''زر پرستی'' بھی اس کا نتیجہ ہے۔زر پرستی کا یہ رجحان ہر مثبت قدر کی نفی کر رہا ہے اور معاشرے کو بحران و انتشار کی کھائیوں میں دھکیل

رہا ہے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ موجود سماجی و تہذیبی صورت حال میں یہ رجحان اور بڑھے گا اور اقبال کے تصور تہذیب کی مزید نفی کرے گا۔ اقبال نے تو یہ کہا تھا:

ضمیر پاک و نگاہ بلند و مستی شوق　　　نہ مال و دولت قاروں، نہ فکر افلاطوں

اس شعر کا پہلا مصرع اقبال کے تصور فرد کی ترجمانی کرتا ہے اور دوسرا مصرع سرمایہ دارانہ زر پرستی اور مغربی فکر کی نفی کرتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں صورت حال یہ ہے کہ ہم دوسرے مصرع کو اپنا کر اپنے عمل سے پہلے مصرع کی نفی کر رہے ہیں اور تیز تر گامزن منزل مادورنیست کے کورس Chorus کے ساتھ اسی راستے پر گامزن ہیں۔ اس سارے عمل کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم فکر افلاطون کی جن بنیادوں پر اپنی تہذیبی عمارت کھڑی کر رہے ہیں اور تقلید و پیروی مغربی کی جس صورت حال سے مسلسل دوچار ہیں ہم نے گزشتہ ۴۵ سال کے عرصے میں کسی شعبہ زندگی میں ایک بڑا آدمی نام کو بھی پیدا نہیں کیا۔ یاد رکھیئے کہ بڑا آدمی تخلیقی قوتوں کی حقیقی نشوونما سے پیدا ہوتا ہے، آنکھ بند کر کے پیروی و تقلید سے پیدا نہیں ہوتا

حلقہ شوق میں وہ جرأت اندیشہ کہاں
آہ! محکومی و تقلید و زوال تحقیق

ہم نے مزید کمال یہ کیا کہ ایک بیرونی اجنبی زبان کو ذریعہ تعلیم بنا کر تخلیقی قوتوں کی نشوونما کا راستہ ہی روک دیا ہے اور اپنے ذہین ترین فرد کو تقلید کا بالجبر پابند بنا دیا ہے۔ ہمارا ہر تعلیم یافتہ فرد دو تہذیبوں کے نظام کشش میں اس طرح پھنسا ہوا ہے کہ اس کشمکش نے اسے تہذیبی سطح پر ادھ موا کر دیا ہے۔ اقبال نے کہا تھا۔

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا　　　کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ

اقبال تو عظمت تہذیب کا راستہ یہ بتاتے ہیں:

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے　　　وہ کیا تھا؟ زور حیدر، فقر بوذر، صدق سلمانی
یا د
ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہانگیری　　　یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نکتہ ایماں کی تفسیریں
تمیز بندہ و آقا فساد آدمیت ہے　　　حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

--------

برخلاف اس کے ہم آج قیصر و کسریٰ کے حاشیہ بردار ہیں۔ زور حیدر، فقر بوذر، صدق سلمانی کا ہم سے دور کا رشتہ بھی باقی نہیں رہا۔ اقبال نے تمیز بندہ و آقا کو فساد آدمیت کہا ہے اور ہم نے اپنے معاشرے میں

عوام وخواص کے دو ایسے طبقات کو گزشتہ ۵۵ سالوں میں پروان چڑھایا ہے کہ آج اس نے سارے معاشرے کو فسادِ آدمیت کی واضح صورت دے دی ہے۔ایک فی صد خواص ننانوے فی صد عوام کے حقوق غصب کیے ہوئے طرح طرح کی چیرہ دستیوں میں مصروف ہیں۔اگر ہم اسی راستے پر چلتے رہے اور جیسا کہ اندازہ ہوتا ہے کہ چلتے رہیں گے تو اکیسویں صدی میں یہ آتش فشاں پھٹ جائے گا اور اس سے نکلنے والا لاوا ہمیں جلا کر خاک کر دے گا۔

اس تقلید' اس نظام تعلیم و ذریعہ تعلیم سے جو نسل پیدا ہو رہی ہے اس کا اپنی تہذیبی قدروں سے بہت کمزور اور بودا رشتہ باقی رہ گیا ہے۔اقبال کے رمزیات و کنایات' علامات و تلمیحات اب اس سے کلام نہیں کرتے۔آنے والے زمانے میں یہ رشتہ اور کمزور ہوگا اور اسی کے ساتھ ہم اپنی شناخت گم کر دیں گے اور اکیسویں صدی میں جو پاکستانی نسلیں سامنے آئیں گی ان کے لیے اقبال کے پیغام میں کوئی دل کشی اور کوئی دلچسپی باقی نہیں رہے گی۔ہواؤں کا رخ جس طرف ہے اور جس رخ پر ہم چل رہے ہیں اس میں یہ بات واضح طور پر نظر آتی ہے۔آپ آج کی محفل میں اکیسویں صدی میں پیغام اقبال کی بات کر رہے ہیں اقبال نے جو پیغام بیسویں صدی کو دیا تھا ہم نے تو اس راستے ہی کو چھوڑ دیا ہے۔جب راستہ ہی بدل لیا تو پھر منزل بھی کوئی دوسری ہوگی۔وہ منزل جس کی طرف ہم آنکھیں بند کر کے تیزی سے بڑھ رہے ہیں' اس سفر میں اقبال ہمارا راہبر' ہمارا مفکر نہیں رہے گا۔ہماری زندگیوں کے اعمال سے عظیم اقبال کا کوئی گہرا تعلق باقی نہ رہے گا۔اس کا پیغام بھی ہمارے لیے بے معنی ہو چکا ہوگا۔اقبال کی عظمت اس میں ہے کہ انہوں نے اپنی روایت' اپنی تہذیب سے گہرا رشتہ قائم کر کے مغرب کے اثرات کو شعور کے ساتھ عمل امتزاج سے گزارنے کی کوشش کی تھی۔اقبال کے برخلاف ہم مغرب کو آنکھیں بند کر کے بے شعوری سے اوڑھ رہے ہیں اور اس طرح اوڑھ رہے ہیں کہ ہم اپنی تہذیبی قدروں اور نظام فکر کو بھلا بیٹھے ہیں۔نتیجہ یہ ہے کہ ہم اشیاء اور فکر دونوں سطح پر مغرب کی منڈی بن کر رہ گئے ہیں۔نصاب تعلیم' ذریعہ تعلیم' فکر و عمل کے مثالی نمونے' صنعت و حرفت سرمایہ دارانہ نظام' رنگا رنگ فیشن سب کچھ آنکھیں بند کر کے ہم مغرب سے درآمد کر رہے ہیں۔چین نے بھی ''مغرب'' درآمد کیا تھا اور جاپان نے بھی یہ کام کیا تھا مگر انہوں نے اپنے نظام فکر' اپنے طرز احساس اور نظام اقدار سے اپنا رشتہ باقی و برقرار رکھا تھا۔تعلیم کو اپنی اپنی زبانوں میں دیا تھا۔انہوں نے ہر چیز کو اپنی تہذیبی و فکری سطح پر قبول کیا تھا تاکہ ان کے معاشرے کے فرد کی تخلیقی قوتیں پروان چڑھ سکیں۔ان دونوں ملکوں کی ترقی کی روداد آپ کے

سامنے ہے۔ ہم اس کے برعکس راستے پر چل رہے ہیں اور اپنی تخلیقی قوتوں کو موت کی نیند سلا رہے ہیں۔ اس صورت حال میں، جس میں آج ہم زندگی بسر کر رہے ہیں جب اکیسویں صدی کے دو تین عشرے گزریں گے تو ہم ''بے اصل'' دوسرے اور تیسرے درجے کے بظاہر مغربی بن کر اقبال کی شاعری کو پڑھیں گے تو آپ خود بتائیے کہ وہ ہمیں کیا دے گی؟ اس میں ہمارے لیے کیا کشش ہوگی؟ اس وقت تک افتخار کرنے کے لیے ہمارے پاس کچھ بھی باقی نہیں بچے گا احساس عظمت زائل ہو جائے گا اور اقبال ہمارے لیے اور ہم اقبال کے لیے اجنبی بن کر رہ جائیں گے۔ پیر ہندی کا مولانا روم، شیراز کے حافظ و سعدی، عظیم غالب اور عظیم اقبال کی شاعری اور تہذیبی طرز احساس ہمارے لیے نور کا باعث نہیں ہوگا اور ہم ایک محصور و بے بنیاد قوم بن کر زندگی بسر کر رہے ہوں گے۔

مجھے معلوم ہے کہ یہ حقیقی تصویر، جو میں نے آپ کے سامنے پیش کی ہے، آپ کو ناپسند ہوگی لیکن میں کیا کروں حقیقی صورت یہی ابھر کر سامنے آتی ہے۔ پاکستان میں پیدا ہونے والے جڑواں بچوں میں سے ایک میرے گھر میں ایک امریکہ میں پلا بڑھا۔ جوان ہو کر جب دونوں ایک دوسرے سے ملے تو وہ دونوں ہر حوالے اور ہر اعتبار سے مختلف اور اجنبی تھے۔ تہذیب و ثقافت اور نظام اقدار کا یہ وہ اثر ہے جو دو نسلوں کو ایک دوسرے سے مختلف و بیگانہ کر دیتا ہے۔ جن خطوط پر اور جس نظام تعلیم سے ہماری نسلوں کی آج تربیت ہو رہی ہے۔ ایک محدود طبقہ خواص جس طرح معاشرے پر اپنے مفادات کے نظام کو مسلط کر رہا ہے وہ نسلیں، اپنی تہذیب کی جڑوں سے کٹ کر، اقبال کے پیغام و شاعری سے اسی طرح بیگانہ ہو جائیں گی جس طرح دو سگے جڑواں بھائی ایک دوسرے کے لیے اجنبی و بیگانہ ہو گئے ہیں۔ جیسے جیسے یہ عمل ہمارے ہاں تیز ہو رہا ہے ہم بے شناخت ہو کر اپنی تہذیب کی بنیادوں سے دور سے دور ہوتے جا رہے ہیں اور نئے نئے بحرانوں میں مبتلا ہو رہے ہیں۔

یہ سطور لکھ کر میں قدامت پسندی یا رجعت پسندی کی بات نہیں کر رہا ہوں لیکن یہ ضرور کہہ رہا ہوں کہ اپنی تہذیبی جڑوں کے ساتھ پیوستہ رہ کر اگر ہم عہد حاضر کے نئے تقاضوں کو قبول و جذب کریں گے تو ہم یقیناً خوب پھلیں پھولیں گے۔ اقبال نے بھی یہی کہا تھا کہ ''پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ'' اور یہی بنیادی بات ہے۔ یہ بات ویسی ہی ہے جس کا آپ مشاہدہ کرتے رہے ہیں کہ جب آپ آم کی قلم لگاتے ہیں تو قلمی آم کی شاخ پر نہیں لگاتے بلکہ دیسی آم کے پیڑ کی شاخ پر اسے پیوند کرتے ہیں جس کی جڑیں دور تک زمین میں پھیلی ہوتی ہیں۔ یاد رکھیے فکر و خیال کی سطح پر بھی پیوند کاری اسی طریقے سے ہوتی ہے۔ ہم بدقسمتی سے اس

معلوم و مجرب طریقے پر عمل نہیں کر رہے ہیں حالانکہ جانتے ہیں کہ جاپان نے نئی تہذیب کی پیوند کاری اسی طرح کی تھی اور آج وہ اسی لیے زندہ و توانا بھی ہے اور عزیز جہاں بھی۔ اقبال نے جو عالمگیر اصول پیش کیا تھا وہ بھی یہی تھا۔

برعیار زندگی خود را بزن

اور اسی اصول سے اقبال نے زمانے کے سمندر سے ''گوہر فردا'' نکالا تھا۔ ذرا آپ بھی سنیے اقبال ہم سے کیا کہہ رہے ہیں:

لبالب شیشہ تہذیب حاضر ہے مئے لا سے — مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانہ الا

غلامی کیا ہے؟ ذوق حسن و زیبائی سے محرومی — جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا

بھروسا کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر — کہ دنیا میں فقط مردان حر کی آنکھ ہے بینا

وہی ہے صاحب امروز جس نے اپنی ہمت سے — زمانے کے سمندر سے نکالا گوہر فردا

---

آج اقبال کی یہ سوچ اور یہ انداز فکر نئی نسلوں کے لیے اجنبی بن کر رہ گیا ہے اور اس لیے اجنبی بن گیا ہے کہ ہم نے برسوں ہوئے اس راستے کو چھوڑ دیا ہے۔ اقبال کے تعلق سے ہم جو کچھ کہتے رہتے ہیں وہ عام طور پر محض منافقت ہے اور زبانی جمع خرچ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اپنے باطن کی گہرائیوں میں ہم نے دراصل فکر اقبال کو مسترد کر دیا ہے۔ اس تہذیبی، تعلیمی، سماجی اور فکری صورت حال میں اب آپ خود بتائیے کہ حضرت اقبال اور ان کے پیغام کا اس ''پاک سرزمین'' میں کیا مستقبل ہے؟

یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ زمانہ مستقبل کہیں آسمان سے نہیں اترتا بلکہ وہ تو خود زمانہ حال کی کوکھ سے جنم لیتا ہے۔ زمانہ مستقبل میں زمانہ حال ہمیشہ شامل ہوتا ہے۔ جو کچھ ہم زمانہ حال میں بوئیں گے وہی کچھ زمانہ مستقبل میں کاٹیں گے۔ یہی ہوتا آیا ہے اور یہی ہوتا رہے گا۔ اقبال نے بھی اسی اصول کو تسلیم کیا ہے اور نہ ماننے کی صورت میں کہا ہے:

گفتند جہان ما آیا بتو می سازد — گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

---

ڈاکٹر محمد معزّ الدین

# ہماری قومی زبان کی لسانی ہمہ گیریت

ہر شخص فطری طور پر اپنی زبان سے محبت کرتا ہے کیونکہ زبان ہی وہ آلہ لسان ہے جس سے انسان اپنا مافی الضمیر دوسروں پر ظاہر کرسکتا ہے۔ اظہار خیال اور ابلاغ کے دوسرے ذرائع بھی ہیں۔ مثلاً اشارے' کنایے وغیرہ' مگر سب محدود۔ اظہار مدعا دوسرے ذرائع ابلاغ سے ممکن تو ہے مگر میٹھے بول سے دلوں کو موہ لینے والی کیفیت ان میں کہاں۔ یہ زبان ہی ہے جس کے متعلق شاعر نے کہا ہے کہ

جہانگیری کریگی یہ زباں نور جہان بنکر

تو آیئے دلوں کو تسخیر کرنے والی اس زبان' جادو بیان کے چہرے سے نقاب الٹ کر ذرا دیکھیں تو کہ اس رخ روشن کی تابنا کی کی کیفیت کیا ہے۔ اور یہ ناظورہ صد جمال کیا جادو جگارہی ہے۔

دنیا میں ہزاروں زبانیں بولی جاتی ہیں اور ہر زبان کی اپنی اپنی جگہ پہ اہمیت ہے۔ اور اس کا بولنے والا اس سے پیار کرتا ہے۔ پاکستان میں بھی اپنے اپنے علاقے کی الگ الگ زبانیں ہیں اور ہر ایک کا رنگ نرالا اور ہر ایک کا ڈھنگ نیارا ہے۔ اپنی اپنی بولی بولنے والا اس کا رسیا ہے۔ اس چمن کی بوقلمونی انہی گل بوٹوں سے ہے۔

قائداعظمؒ نے کچھ سوچ کر ہی اس کا فیصلہ کیا تھا کہ پاکستان کی زبان اردو اور صرف اردو ہوگی۔ مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اب تک اس کو اس کا جائز مقام نہیں دیا گیا۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد ہی ایک قومی زبان کی بجائے دو قومی زبانوں کے نعرے بلند کئے جانے لگے۔ قومی یکجہتی اور ہماری فکری ہم آہنگی پر یہ پہلی کاری ضرب تھی جو بالآخر ملک کو دو لخت کرنے پر منتج ہوئی۔ اردو کے مقابلے میں بنگلہ زبان کا شاخسانہ دانستہ طور پر کھڑا کیا گیا۔ اس کا اصلی سبب اسلامی اخوت کے مقابلے میں بنگالی نیشنلزم کا پرچار تھا۔ ورنہ بنگلہ زبان سے نہ کسی کو تعرض تھا نہ اردو زبان سے اس کا کوئی تصادم۔ بنگلہ زبان اپنی جگہ پر ایک ترقی یافتہ زبان ہے۔ اس کا اپنا الگ ایک مزاج ہے اور علیحدہ رسم الخط۔ اس میں لٹریچر کا اچھا ذخیرہ موجود ہے۔ مگر اس پر ہندو ویدانت اور ٹیگوریت کی ایسی چھاپ تھی کہ ہمارے تہذیبی ورثے' اسلامی فکر اور ملی تقاضے سے ہم آہنگی نہ ہو

سکی۔ اغیار نے جب یہ دیکھا کہ پاکستان میں اگر اردو بحیثیت قومی زبان رائج ہوگئی تو ہمیں بنگلہ زبان کے ذریعہ بنگالی مسلمانوں کے ملی تشخص کو ختم کرنے میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑیگا کیونکہ اردو زبان مسلمانوں کی تہذیب وتمدن کی ترجمان ہے۔ دشمنوں نے سازشوں اور اپنی حکمت عملی سے اس کو خوب ہوا دی اور ہم نے بھی بروقت اس سیلاب بلا سے بچنے کے لئے کوئی معقول تدارک نہ کیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بنگالی مسلمان اردو زبان کو متبرک زبان سمجھتے تھے اور اس کی تحریروں کو آنکھوں سے لگاتے تھے۔ اس رسم الخط میں لکھا ہوا کاغذ کا کوئی ٹکڑا زمین پر پڑا نظر آتا تو اسے قرآنی حروف سمجھ کر چومتے تھے۔ مولانا اکرم خاں اور ان کے ہم خیالوں نے بنگلہ زبان کو اردو رسم الخط میں لکھنے کی عملی صورت پیدا کردی تھی۔ اسی مقصد کے پیش نظر ایک رسالہ ''حروف القرآن'' چاٹگام سے جاری کیا گیا تھا۔ مگر ہماری غفلت اور دشمنان اسلام کی ریشہ دوانیوں سے وہ بساط ہی الٹ گئی۔ اور 'وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا' اس کے پیچھے جو ان کے سیاسی اغراض ومقاصد تھے وہ اظہر من الشمس ہیں۔ عیاں راچہ بیاں۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی بنیاد سب سے پہلے اسی لسانی اخلاف سے پڑی۔ اور ان کے مطالبوں نے ایک خوفناک صورت اختیار کرلی۔ ہمیں اس سے سبق سیکھنا چاہیے۔ جب یہ زہر افراد سے نکل کر پوری قوم کی رگ وپے میں سرایت کرجائے تو پھر اس زہر کا تریاق ممکن نہیں۔ ہماری مجرمانہ غفلت اور لسانی بے توجہی کے سبب یہ دن دیکھنے پڑے۔ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ مشرقی پاکستان میں ہم نے اردو کو بنگالیوں کے لئے تو لازمی زبان قرار دے دیا مگر اردو داں طبقے کے بچوں کے لئے بنگلہ زبان لازمی قرار نہ دی۔ جس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ اردو ہم پر مسلط کی جارہی ہے۔ دوری اور بڑھتی گئی۔ اس سے محبت ویگانگت کی فضا پیدا نہ ہوسکی۔ افہام وتفہیم سے کام نہ لیا گیا ہم نے اپنے رویے میں زیادہ شدت اختیار کرلی۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ اس واقعے کے بعد ہمیں چاہیے کہ یہاں کی علاقائی زبانوں کو پھلنے پھولنے کا پورا موقع دیا جائے تاکہ قومی زبان اردو کو زیادہ سے زیادہ فروغ حاصل ہو۔ گو اردو اور بنگلہ کا قصہ' قصہء پارینہ بن چکا ہے مگر ہے ہمارے لئے سبق آموز۔

تازہ خواہی داشتن گرداغہائے سینہ را گاہے گاہے باز خواں ایں قصہء پارینہ را

ہمیں اپنی قومی زبان کی حفاظت' فروغ اور آبیاری کی کوششوں میں کوتاہی نہیں کرنی چاہئے۔ دوسری زبانوں کے اختلاف کے رنگ وبو سے اس کی چمک دمک اور نکھر جائیگی۔ زبان میں وسعت' پائیداری اور لچک عوام وخواص میں اس کی مقبولیت اور رابطے سے ہی پیدا ہوگی۔ ورنہ سنگھاسن پر بیٹھنے والی زبانوں کا

حشر ہم دیکھ چکے ہیں۔ سنسکرت اور پالی جیسی کلاسیکی اور سربرآوردہ زبانیں آج صرف تاریخ کا حصہ ہیں۔
ہماری زبان کو قومی زبان بننے کا افتخار اس کی اپنی لسانی خصوصیات اور منفرد خوبیوں ہی سے حاصل ہے اس میں رابطہ کی زبان بننے کی خوبیوں کے علاوہ علمی، تحقیقی سائنسی تکنیکی اور فنی علوم کو جذب کرنے اور ان کے معیار کو برقرار رکھنے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ اس نے پہلے اینگلو عربی کالج دہلی اور پھر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں کامیاب تجربہ کرکے اپنی صلاحیتوں کا سکہ بٹھا دیا ہے۔ جامعہ عثمانیہ میں نہ صرف جدید ایجادات وانکشافات کے مطابق معیاری اصطلاحیں وضع کی گئیں بلکہ میڈیکل اور انجینئر نگ کی اعلیٰ تعلیم بھی اردو زبان کے ذریعہ دی گئی۔ اس زبان کو ذریعہ تعلیم بنا کر دنیا سے اس کی وسعتوں اور صلاحیتوں کا لوہا منوالیا گیا ہے۔ یورپ کے ایک میڈیکل جرنل کی سروے رپورٹ کے مطابق عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے جو ڈاکٹر اردو کے ذریعہ تعلیم حاصل کرکے اعلیٰ ڈگری کے لئے یورپی درسگاہوں میں گئے ان کی کارکردگی اور صلاحیتیں انگریزی کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنے والوں سے کسی طرح کم نہ تھیں۔

جو لوگ انگریزی کی خواہ مخواہ حمایت اور اردو کی بلاوجہ مخالفت کرتے ہیں وہ محض احساس کمتری اور تنگ نظری کے شکار ہیں انگریزی کی اہمیت اور افادیت سے کس کو انکار ہے۔ مگر قومی زبان کے وقار اور اس کی عظمت سے ہی ہمارا اپنا تشخص قومی اور افتخار وابستہ ہے۔ ہماری اس لسانی عصبیت اور فکری کم مائیگی سے ہمارے قومی اتحاد اور ملی ہم آہنگی کو بڑا نقصان پہنچ رہا ہے۔ ایسے مغرب زدہ حضرات کے لئے کیا کہا جا سکتا ہے بجز اس کے کہ

اے موج بلا ان کو بھی ذرا دو چار تھپیڑے ہلکے سے
کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفاں کا نظارہ کرتے ہیں

کبھی کبھی یہ بھی سننے میں آتا ہے کہ اردو زبان دیگر پاکستانی زبانوں کے مقابلے میں کم عمر ہے۔ یہ بات بہت بڑے مغالطے پر مبنی ہے اور لسانی تاریخ اور اس کے پس منظر سے عدم واقفیت کی دلیل۔ اس کی قدامت مسلّم ہے۔ اس کا منبع و ماخذ ہندوستان و پاکستان کی قدیم ترین زبانیں ہیں۔ یہ درست ہے کہ اس زبان کا نام اردو دور مغلیہ کی پیداوار ہے۔ مگر زبان کا رشتہ صدیوں پرانا ہے۔

سنسکرت اور ڈراویڈی زبانوں کی آمیزش سے جو بولیاں نمودار ہوئیں ان کی کوکھ سے پراکرتوں نے جنم لیا اور تدریجی طور پر ترقی کرکے مختلف علاقوں میں مختلف پراکرتیں ابھریں ان پراکرتوں میں سے بعض

پراکرتوں نے بہت جلد نمایاں ہو کر امتیازی حیثیت اختیار کر لی جو پراکرت سرزمین دوآبہ میں زیادہ نمایاں اور ممتاز تھی اسے سراسینی پراکرت یا کھڑی بولی کہتے تھے چونکہ مختلف بولیوں کے الفاظ ملے جلے ہوتے تھے لہذا ان کی آمیزش کی بنا پر اس کا نام مغلیہ دور میں اردو رکھ لیا گیا۔ یہ بذات خود ترکی زبان کا لفظ ہے۔ اور معنی کے اعتبار سے لشکر کا مفہوم رکھتا ہے۔ جس میں ترک وتتار' افغانی اور ایرانی سب ہی شامل تھے۔ یہ امر بجائے خود اس بات کا غماز ہے کہ اس کے دل میں شروع سے ہی کتنی فراخی اور وسعت موجود ہے۔ چنانچہ اس میں سنسکرت کی قدامت بھی ہے' پالی کا تقدس بھی' ہندی کی نزاکت بھی' بھوجپوری اور پنجابی کی صلاحیت بھی' بلوچی اور سندھی کی شیرینی بھی اور پشتو کی اسلامی روح بھی۔ یہی زبان کبھی ہندی' ہندوی اور ہندوستانی کے نام سے پکاری جاتی رہی ہے۔

جب اس کے مولد و ماخذ کی لسانی اعتبار سے تلاش ہوئی اور لسانی تجزیہ پیش کیا جانے لگا تو اپنی اپنی تحقیق اور فکر ہر کس بقدر ہمت اوست کے مطابق اپنے اپنے علاقے کی اولیت ظاہر کرنے کے لئے مختلف ادیبوں اور محققوں نے اس کی جنم بھومی اپنے ہی علاقے کو قرار دی۔ مثلاً نصیر الدین ہاشمی نے دکن بتایا' حافظ محمود شیرانی نے پنجاب' مولانا سید سلیمان ندوی نے سندھ' کسی نے گجرات بتایا پروفیسر نجم الہدیٰ اور اختر اورنیوی نے میتھلی زبان کو اس کا ماخذ بتایا اور ڈاکٹر شوکت سبزواری نے پالی زبان کو اس کی ماں بتایا۔ ان سب کا کہنا کسی حد تک درست بھی ہے۔ مگر ان کے بیان میں نیم صداقت ہے۔ جس کو جس زبان سے مماثلت نظر آئی اسی کو اس کا منبع قرار دیا کیونکہ اس کے الفاظ اور اجزائے ترکیبی ان سب زبانوں سے کم وبیش مماثل ہیں۔ یہ سب اسی درخت کی شاخیں ہیں جس کی جڑیں زمین کی گہرائی میں دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ چنانچہ اردو سب کی ہے۔ اس کے آئینے میں ہر علاقے کا عکس ہے۔ یہ گملے کا پودا نہیں۔ برگد کا بہت پرانا درخت ہے جس کی جڑیں تحت الثریٰ تک پھیلی ہیں اور شاخیں آسمان کو چھو رہی ہیں۔ غرضکہ اردو ایک ایسی زبان ہے جو ہندو پاک کی مشترکہ زبان ہے۔ جو عام ضرورت اور حالات کے مطابق وجود میں آئی۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ مختلف زبانوں میں جب یہ دوسرے ناموں سے بھی پکاری جاتی رہی ہے تو پاکستان کے معرض وجود میں آتے ہی اگر ہم اسے پاکستانی نام دے دیتے اور اسے پاکستانی ہی کہہ کر پکارتے تو یہ عربی اور فارسی' انگریزی' جرمن' اطالوی' فرانسیسی' روسی اور ہندی کی طرح پاکستانی ہی کہلاتی اور ان زبانوں کی طرح اپنے وطن کے نام سے موسوم اور ہم آہنگ ہوتی۔ بہرکیف اردو' مسلمانوں کے ہاتھوں پروان

چڑھی اور پاکستان میں اسے قومی زبان بننے کا فخر حاصل ہوا مسلمانوں نے شروع ہی سے اس کا رسم الخط الگ کرلیا جس کی وجہ سے یہ عربی اور فارسی سے قریب تر آ گئی۔ اس میں اسلامی لٹریچر کی جب بہتات ہوگئی اور مسلم قومیت کی شناخت تو اردو و ہندی کا جھگڑا کھڑا کیا گیا حتیٰ کہ گاندھی جی نے یہاں تک کہہ دیا کہ اردو سے مخالفت کا سبب یہ ہے کہ یہ قرآنی حروف میں لکھی جاتی ہے۔ اب ذرا اس کے اجزائے ترکیبی پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں۔ کسی زبان کی ساخت Structure کو جانچنے کے لئے اس کے اسما اور اس کی صفات سے صحیح نشاندہی نہیں ہوتی۔ بلکہ افعال ہماری رہنمائی کرتے ہیں جن پر کسی زبان کا پورا ڈھانچہ کھڑا ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے اگر ہم اردو کا جائزہ لیں تو ہم دیکھیں گے کہ تقریباً سارے کے سارے افعال اس کے وہی ہیں جو دیگر پراکرتوں ہندی، ہندوستانی زبان کے مثلاً کرنا، کہنا، بولنا، ہنسنا، رونا، کھانا، پینا، چلنا، پھرنا، سونا، اٹھنا، بیٹھنا وغیرہ معدودے چند فارسی کے جو انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں جیسے خریدنا، بخشنا، قبولنا وغیرہ، مگر اردو میں آ کر اس کے مصادر سے قطعی طور پر ہم آہنگ ہوگئے یہ اس زبان کا کرشمہ ہے۔

البتہ کثرت سے اسمائے صفات، حروف اور سابقے لاحقے وغیرہ عربی اور فارسی سے ماخوذ ہیں۔ اور ان زبانوں کے الفاظ کی بہتات ہے۔ اس طرح عربی اور فارسی الفاظ نے اردو گرامر کی صرفی اور نحوی ترکیبوں میں گھل مل کر اس کی وسعت اور جامعیت میں بے پناہ اضافہ کیا ہے۔ یہ موضوع ایک الگ مضمون کا متقاضی ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں، اردو کا مابہ الامتیاز، عربی، فارسی رسم الخط ہے۔ جس کی وجہ سے یہ زبان اپنے ثقافتی ورثے کے قریب آ گئی اور اسلامی دنیا میں اس رسم الخط اور اپنے لٹریچر کی وجہ سے اس کی شہرت بڑھی۔ اور زبان میں تنوع اور ہمہ گیری پیدا ہوگئی۔ اس کی وسعت بیان کا اندازہ، لسانی، باریکیوں میں گئے بغیر چند مثالوں سے ہی ہو جائیگا۔ مشکل سے کسی اور زبان کو یہ طرہ امتیاز حاصل ہے کہ اظہار خیال کے لئے ایک ہی فقرے کی ادائیگی کے لئے صرفی اور نحوی ترکیبیں میسر ہوں۔ مثلاً لخت جگر کہیئے یا جگر کا ٹکڑا یعنی اضافت کے ذریعہ بھی یا حروف فاعلی کے ذریعہ جس طرح چاہیں صرفی ترکیب وضع کر لیں۔ بنت حوا لکھئے یا حوا کی بیٹی۔ آسانی سے موقع اور ضرورت اور جملے کے ترکیبی حسن کے مطابق جو چاہیں استعمال کر لیں۔

حرف عطف 'واؤ' سے بھی کام لیجئے اور حرف 'اور' سے بھی۔ باغ و بہار لکھئے یا باغ اور بہار اسی طرح عربی فارسی الفاظ کی جمع بنانیکی بیک وقت دو دو صورتیں ہیں۔ مسجد کی جمع مساجد بنائیے یا مسجدیں یا مسجدوں

استعمال کیجئے یعنی اردو قوائد کے لحاظ سے فاعلی اور مفعولی حالتوں کے ساتھ یہ لفظ کلی طور پر ہم آہنگ ہے۔ حتیٰ کہ انگریزی الفاظ کے لئے بھی ایسی ہی ترکیبیں وضع کرلی جاتی ہیں یعنی یونیورسٹیاں اور یونیورسٹیوں جیسی ترکیبیں نہایت آسانی سے ڈھال لی جاتی ہیں۔ یہ آپ کے اپنے حسن انتخاب یا جملے کی ساخت کے تقاضے پر منحصر ہے یہ سہولتیں دیگر آریائی نژاد یا یورپی زبانوں میں کس کو حاصل ہے؟

دوا کی جمع دوائیں اور دواؤں بھی لکھئے اور ضرورت ہو تو اس کی جمع ادویہ بھی استعمال کیجئے۔ جملے فقرے کے حسن میں کمی نہیں آئے گی بلکہ بسا اوقات اضافہ ہی ہو جائے گا بلکہ جی چاہے تو جمع الجمع بنا کر ادویات بھی استعمال کرلیجئے۔ عربی 'فارسی کی قربت سے صرف اردو زبان کو یہ امتیاز حاصل ہے۔

صرفی اور نحوی اصولوں سے قطع نظر صوتی لحاظ سے غور کیجئے تو اس کی وسعت اور تنوع کا اندازہ ہوگا زبان کا ڈھانچہ اگر ہندی ہے تو عربی اور فارسی کی آمیزش نے اس کی صوتی خصوصیات و اثرات کا دامن اور وسیع کردیا ہے۔ اردو کے صوتی حروف Phonemes اپنے مخرج اور طریقہ ادائیگی Point of articulation and manner of articulation کے اعتبار سے دیگر زبانوں سے کہیں زیادہ ہیں۔

ذ' ز' ژ' ض' ظ کی آوازیں بعض زبانوں میں ممکن نہیں۔ ان کے لئے علیحدہ علامتی نشان Diachtrical Mark استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ جو رسم الخط کو بوجھل بنادیتے ہیں اور ٹائپ میں بھی مشکل پیدا کرتے ہیں۔ بعض آوازیں مثلاً پ' چ کی آواز میں عربی میں ممکن نہیں ذرا غور کیجئے عربی میں 'پاکستان' 'باکستان' بن جاتا ہے۔ جو مفہوم کے اعتبار سے کس قدر مضحکہ خیز ہے۔

اسی طرح کوزی آوازیں Retroflex Sounds مثلاً ٹ' ڈ' ڑ وغیرہ کی آوازیں خالص آریائی نژاد ہیں۔ اردو نے اپنے صوتی دائرے میں کس طرح سمیٹ لیا ہے۔ جس سے صوتی لچک اور وسعت پیدا ہو گئی ہے۔

اسی طرح ہمارے سابقے' لاحقے بھی زیادہ ہیں' فارسی کے عربی کے ہندی کے۔ سابقے Prefix لاحقے Suffix اور درمیانی آواز بطور Infix مثالوں سے میں زیادہ بوجھل نہیں بنانا چاہتا۔ فقط ایک ہی مثال لیجئے: ان پڑھ۔ ناخواندہ۔

اب آیئے اردو کی انجذابی صلاحیت Assimilative Power پر نظر ڈالیں۔ ہندی اور مقامی زبانوں سے قطع نظر لاطینی' انگریزی' پرتگالی' جرمن وغیرہ زبانوں کے الفاظ بھی کس خوبصورتی کے ساتھ اپنی

زبان کے صوتی آہنگ کا جزو بنالئے گئے ہیں۔Bottle سے بوتل Hospital سے ہسپتال بنا کر اپنے صوتی و نحوی قائدے کے مطابق اپنی زبان کے دوسرے لفظوں کے ساتھ ہم آہنگ کرلیا ہے۔ چند مثالیں محض مشتے از خروارے کے طور پر پیش کی گئی ہیں ورنہ الفاظ کے اس بحر بیکراں میں کتنے ہی انمول موتی پڑے ہیں جو اس کی تہہ میں غوطہ لگانے والوں کے ہاتھ آسکتے ہیں۔ اس زبان کی خوبیوں کے کتنے ہی ایسے پہلو ہیں جو ہماری آنکھوں سے اوجھل ہیں۔ بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست۔

حکیم الامت علامہ اقبال نے اس کی تزئین و آرائش کی تلقین کی تھی اور کہا تھا کہ

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے　　　شمع یہ سودائی دلسوزیٔ پروانہ ہے

اتنے عرصے میں کیا ہم نے وہ شانہ بہم پہنچایا ہے۔ جو اس کے گیسو سنوارے؟ کہاں ہیں وہ پروانے جو اس شمع کے گرد طواف کر کے اپنی دلسوزی کا ثبوت دے رہے ہوں؟ پاکستان کا وجود بڑی حد تک اردو زبان کا مرہون منت ہے۔ کیونکہ دیگر نزاعی مسائل کے علاوہ لسانی اختلاف بھی علیحدہ مملکت کے مطالبے کی ایک اہم شق تھی۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق، مولانا صلاح الدین، مولانا ظفر علی خاں، ڈاکٹر سیّد عبداللہ چند نام ایسے ہیں جن کی اس سلسلے میں خدمات قابل صد ستائش ہیں۔

مگر ہم نے اسی پاکستان میں اپنے عربی رسم الخط ہی کو بدل کر رومن رسم الخط رائج کرنیکی ضرورت کو بڑے شد و مد سے پیش کیا۔ بارے چند دور اندیش دانشوروں کی بروقت مداخلت سے یہ فتنہ رک گیا۔ ورنہ ہماری قومی زبان کا حسین چہرہ کب کا مسخ ہوگیا ہوتا۔ ترکی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم، پہلے صدر مقتدرہ قومی زبان جب کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے تو انہوں نے اردو کو ہر تعلیمی شعبے میں نافذ کرنیکی کوشش کی۔ اس وقت کے حاکم اعلیٰ نے انہیں حکم دیا کہ اردو کی ترویج و اشاعت اور اس کے نفاذ میں عجلت سے کام نہ لیں۔

سندھ میں بھی چند مفاد پرستوں نے لسانی ہنگامہ شروع کرایا تھا خدا کا شکر ہے کہ بروقت وہ فتنہ دب گیا۔

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم　　　کہ بامن کرد ہرچہ آشنا کرد

ہماری قومی زبان، ہماری تاریخ، تہذیب، ثقافت اور علم و دانش کا مخزن ہے۔ عربی رسم الخط نے لسان قرآن سے ہم کنار کردیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسے ہر سطح پر ذریعہ تعلیم بنا کر اور دفتری کارروائی اور کاروبار میں اسے فی الفور نافذ کر کے اس کو مزید بلندی اور رفعت عطا کی جائے۔ نہ انگریزی سے

اس کی مخاصمت ہے نہ کسی علاقائی زبان سے تصادم' آزادی حاصل کرتے ہی آخر ہندوستان نے فوراً ہندی کو نافذ کردیا۔ وہاں کتنی ہی مختلف زبانیں ہیں۔ اردو' بنگالی' تامل' تلگو' ملایالم مگر دفتری اور سرکاری زبان ہندی ہی ہے' سب نے اس کی اس حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے ذریعہ تعلیم بنالیا ہے۔

چین' جاپان' روس' ملیشیا' انڈونیشیا' ہر ملک نے اپنی اپنی زبانوں کو ذریعہ تعلیم نیز سرکاری اور دفتری حیثیت دے رکھی ہے۔ مگر ہم اب تک انگریزی کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اردو کو رائج کر کے بھی ہم انگریزی زبان اور اس کے ادب سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ قومی زبان کس طرح ہمارے ذہن پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ذہنی ارتقا اور استحکام کے لئے یہ لازمی ہے کہ ہمارے احساسات اور جذبات کی ہماری زبان پورے طور پر ترجمان ہو۔ تمدنی اور معاشرتی تقاضوں کو اپنے افکار عالیہ کے ساتھ احسن طریقے سے پیش کر سکے۔ انگریزی زبان کے ذریعہ ہماری اخلاقی قدریں' اسلامی تہذیب و تمدن کا حصہ ہرگز نہیں بن سکتی ہیں۔ اپنی روزمرہ کی زندگی میں قرآنی روح کارفرما نہیں ہو سکتی اور نہ ہی اس سے آنیوالی نسل کی ذہنی پرداخت ہو سکتی ہے۔ افکار و خیالات میں تنوع اپنی قومی زبان ہی پیدا کر سکتی ہے۔ شخصیت اور کردار کی تہذیب و تشکیل میں زبان کی جو اہمیت ہے اسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ انفرادی ذہن کے ساتھ جب تک قومی اذہان منقلب نہیں ہوتے' اسلامی فکر و نظر کی بنیاد کھوکھلی رہے گی۔

قومی زبان کو پورے طور پہ دفتری زبان اور ذریعہ تعلیم کے لئے رائج کرنے میں جو تساہل کارفرما ہے اور بیوروکریسی کی طرف سے جو لیت و لعل ہے۔ اس سے ہم اچھی طرح واقف ہیں۔ کچھ لوگ ابھی تک ہمارے قومی تقاضے اسلامی اقدار اور فکر و نظر کی وسعتوں سے ذہنی طور پر ہم آہنگ نہیں۔ جب فکر میں ہی کجی ہو تو عمل میں راستی کہاں سے پیدا ہو گی۔ کبھی بھی ذہنی انتشار و اختلال سے قومی استحکام پیدا نہیں ہوتا۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔

ایک بات اور قابل توجہ ہے کہ ہم اب تک اصطلاح سازی کے چکر سے نہیں نکلے ہیں۔ اصطلاحیں بنتی ہی رہتی ہیں۔ ضرورت خود ایجاد کی ماں ہے۔ ہماری قومی زباں تو کئی زبانوں کا ملغوبہ **Admixture** ہے۔ جب زبان فعال و متحرک ہو کر اپنے اظہار خیال کے لئے اپنے ذخائر الفاظ سے کام لینا شروع کرتی ہے تو ضرورت کے تحت اصطلاحیں خود بخود بننا شروع ہو جاتی ہیں' دہلی کالج' جامعہ عثمانیہ' شعبہ تصنیف و تالیف کراچی یونیورسٹی' مقتدرہ قومی زبان اور مجلس زبان دفتری لاہور نے جو اصطلاحیں وضع کر دی ہیں وہ ہماری ضرورت

کے لئے کافی ہیں۔ اب اردو کو دفتری اور تعلیمی زبان بنانے میں کیا رکاوٹیں ہیں بجز اس کے کہ ہم پرانی لکیر کے فقیر ہیں اور تن آسان۔

اصطلاح سازی کا کام اس کے بولنے والے اور زبان کو برتنے والے کرتے ہی رہتے ہیں۔ ایک چھوٹی سی مثال پیش کرنا چاہتا ہوں میں نے طالب علموں سے کراچی میں ایک نیا لفظ سیکھا۔ میں کراچی یونیورسٹی میں ایک بار لکچر دے رہا تھا تو ایک طالب علم سے سنا کہ وہ کہہ رہا ہے' مجھے فٹا درکار ہے۔ میں چونکا میرے استفسار پر دوسرے طالب علم نے بتایا کہ ہم اسکیل کو فٹا کہتے ہیں یعنی جس سے فٹ ناپتے ہیں۔ دیکھا آپ نے کس آسانی سے غیر شعوری طور پر یہ لفظ ہماری زبان میں داخل ہو کر روزمرہ کے استعمال میں آ گیا۔ اگر ہم دفتری زبان استعمال کرنے لگیں تو اصطلاحیں کثرت استعمال سے خود بخود جزو زبان بن جائیں گی میری ذاتی رائے یہ ہے کہ انگریزی یا دوسری علاقائی زبانوں کے جو الفاظ ہماری زبان پر چڑھ گئے ہیں اور جو زبان زد عام ہیں ہم ان کو اپنی زبان کا جزو بنالیں۔ آج اسٹیشن' ٹیلی فون' موٹر کار انگریزی کے نہیں اردو کے الفاظ ہیں۔ تھرمامیٹر اور لاؤڈ اسپیکر کے لئے کیا ضروری ہے۔ کہ مقیاس الحرارت اور آلہ مکبر الصوت جیسے ثقیل الفاظ استعمال کئے جائیں۔ اگر ہم نے زیادہ اصرار کیا تو ہندوستان کی طرح' بھک بھک اڈا' پتر گھسیڑ' سماچار پتر تو اپنی جگہ پر رہیں گے۔ بولنے والے ریلوے اسٹیشن' لیٹر بکس اور اخبار ہی بولتے رہینگے۔ زبان متکلم کی سہولت کے لئے ہوتی ہے۔ اظہار خیال میں آسانی پیدا کرنے کے لئے نہ کہ قدم قدم پر بوجھل اور ناقابل فہم الفاظ ان کی راہ میں سنگ گراں بنیں۔

عام شکوہ ہے کہ ہمارا معیار تعلیم گرتا جا رہا ہے۔ اسکولوں' کالجوں' اور یونیورسٹیوں کی تعداد میں اضافے ہو رہے ہیں' مگر نہ ہماری خواندگی کی شرح خاطر خواہ بڑھ رہی ہے' نہ معیار بلند ہو رہا ہے۔ اس ترقی معکوس کی کیا وجہ ہے؟ میرے نزدیک اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ہم نے سنجیدگی سے اب تک ذریعہ تعلیم اپنی قومی زبان کو نہیں بنایا۔ کہیں پرائمری میں ذریعہ تعلیم کا جھگڑا ہے تو کہیں اعلیٰ تعلیم' اور فنی تربیت کے لئے انگریزی کا سہارا لیا جا رہا ہے۔ انگریزی کی اہمیت اور بین الاقوامی سطح پر اس کی افادیت مسلم مگر اپنی زبان میں تعلیم سے جو ذہن میں سادگی پیدا ہوتی ہے۔ اس کا بدل کہاں میسر آ سکتا ہے۔ کسی قوم کی قوت متخیلہ اور ادراکی صلاحیت سلب کرنا مقصود ہوتا ہے تو اسکی زبان بدل دیتے ہیں۔ ہمارے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا ہے۔ ہمارا مزاج خوئے غلامی میں کچھ ایسا پختہ ہو گیا ہے کہ ہماری سوچ کی سمت بدل گئی ہے۔ شکست خوردہ قوم کو لسانی اعتبار

سے جب شکست ہوتی ہے تو ان کے تہذیبی اور تمدنی سوتے خشک ہونے لگتے ہیں۔ زبان صرف اظہار خیال کا ذریعہ نہیں ہوتی بلکہ خیالات و افکار کی صورت پذیری کے لئے ایک بہت بڑی موثر قوت ہوتی ہے۔ انسان کی انفرادی اور اجتماعی سوچ کو بدلنے کا ایک موثر ذریعہ۔ یہ ایک راستہ متعین کرسکتی ہے۔ بلندی کا بھی پستی کا بھی انگریزی زبان سے جو ذہنی انحطاط پیدا ہوا اب اس سے نجات کا ذریعہ یہی ہے۔ کہ قلب و نظر کی وسعتوں کے لئے بند ذہنی دریچے فوراً کھول دے جائیں انگریزی زبان کے ذریعہ ہمارے نوجوانوں کی تعلیم ہلاکت خیز ہے۔ بقول علامہ اقبال

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا　　　　کہاں سے آئے صدا لا الہ اللہ

ہمارے ذہن میں ایک خلا سا ہے۔ اسے دور کر کے جلد ہم اپنے علمی سرمائے اور ورثے سے رشتہ جوڑ کر قرآن حکیم کے مقصد و منہاج کے مطابق اپنی تعلیمی درسگاہوں میں اپنی زبان کے ذریعہ اذہان کی از سر نو تزئین و تہذیب کریں۔

مقام افسوس ہے کہ اب تک ہم نے لسانی مطالعے یا زبان کے تقابلی مطالعے کے لئے اپنی درسگاہوں میں کوئی باضابطہ کام شروع نہیں کیا ہے۔ نہ کوئی ایسا مرکز ہے جہاں اپنی تمام زبانوں پر تحقیقی کام ہو رہا ہو۔ دو ایک کتابیں زبان کی تاریخ پر جو موجود ہیں' ان سے ہماری زبانوں کی ساخت اور ان کے لسانی روابط کا پورا احاطہ نہیں ہوتا نہ اس قسم کا کوئی سروے کیا گیا ہے نہ ایسی مہم کا کوئی رجحان ہے۔ غلط قسم کے مفروضے پر یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ہماری علاقائی زبانیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں' اور ان میں باہمی مماثلت نہیں۔ اس سے بڑھ کر اور مماثلت کیا ہوگی کہ سب کا رسم الخط ایک ہے جو ہمیں ایک دوسرے سے قریب کر رہا ہے۔ چونکہ زبان کا باضابطہ مطالعہ نہیں کیا گیا لہٰذا بعض غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ بعض اوقات غلط مفروضے پر غلط نتائج بھی استنباط کر لیتے ہیں۔

آج سے تقریباً نصف صدی پہلے جارج گریرسن نے لنگوئسٹک سروے آف انڈیا گیارہ جلدوں میں لکھی تھی ہم اس پر اضافہ کیا کرتے اس کو دوبارہ شائع کرنے کی بھی کوشش نہیں کی گئی۔ ہندوستان میں البتہ اس کے نئے اڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ وہاں کی بیشتر یونیورسٹیوں میں جدید لسانیات کے شعبے قائم ہیں۔ ہمارے یہاں لسانی مطالعے کی اس کمی کے باعث بعض لسانی مغالطے پیدا ہو جاتے ہیں میں ایک چھوٹی سی مثال پیش کرتا ہوں۔ کچھ عرصہ پہلے ایک بحث اخبار میں چھپی کہ پنجاب میں اسکول کو سکول بولتے ہیں جو درست نہیں۔

اس پر لسانی اور صوتی نقطہ نظر سے غور کیے بغیر جواب الجواب کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ صوتی اعتبار سے بات صرف اتنی ہے کہ انگریزی لفظ School کا صحیح تلفظ سکول ہی ہے۔ اردو میں اسکول لکھا اور بولا جاتا ہے یہ محض اس وجہ سے ہے کہ اردو زبان کے کسی لفظ کے ابتدائی Initial رکن Syllable میں دو مصمتے Consonant Clustere کی گنجائش نہیں۔ جب بھی کوئی ایسا رکن ہو گا تو اس سے قبل ایک مصوتہ Vowel جوڑ دیتے ہیں۔ جو اردو صوتیات کے عین مطابق ہے۔ لیکن پنجابی زبان میں صوتی لحاظ سے انگریزی کی طرح ابتدائی رکن Initial Syllable میں دو مصمتے جائز ہیں' لہٰذا ان کے یہاں انگریزی سکول School سکول ہی رہے گا۔ اردو میں اس کا تلفظ اسکول ہو گا۔ اب اگر پنجابی زبان بولنے والے چاہیں تو تحریری طور پر اسے اسکول لکھ سکتے ہیں۔ محض اتنی سی بات تھی جس نے ایک انگریزی اخبار میں جواب الجواب کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اور زبان سے اہل زبان تک زبان درازیاں شروع ہو گئیں۔ جب تک ہماری زبانوں کے لسانی مطالعے کا کام نہیں ہوتا اس قسم کے مغالطے مغائرت پیدا کرتے رہیں گے۔ ہماری قومی زبان اردو میں بے پناہ صلاحیت موجود ہے کہ ان کیفیات کو اپنے انجذاب و قبول کے دائرے میں وسعت دیکر اپنی ضروریات کے تحت لسانی ہم آہنگی پیدا کر سکے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم اپنی زبان سے محبت کریں۔ کیونکہ یہ نہ صرف رابطے کی زبان ہے بلکہ ہماری قومی امنگوں کی ترجمان اور ہمارے ملی تقاضوں کی پاسبان۔

سوچنے کی بات ہے کہ ہماری تاریخ' آثار قدیمہ اور آرکیولوجی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مگر آج تک مہنجو دارو کی زبان اور رسم الخط کا تعین نہ ہو سکا۔ باہر کے ماہرین السنہ کی مدد لی جاتی رہی ہے۔ وہ کبھی اس رسم الخط کی ڈراوڈی بتاتے ہیں کبھی آئیڈیو گرافی کا نام دیتے ہیں۔ اگر ہمارے یہاں لسانی مطالعے کا کوئی مرکز ہوتا تو ہم اپنی تاریخ کے ان آثار کی زبان کو سمجھنے کے لئے دوسروں کے دست نگر نہ ہوتے۔ حد تو یہ ہے کہ پانینی Panini تقریباً ڈھائی سو سال قبل مسیح ہمارے علاقے ٹکسیلا کا رہنے والا بہت بڑا ماہر لسانیات گزرا ہے۔ سنسکرت میں اس کی کتاب اشٹ ادھیائے لسانیات کی ایک اہم کتاب سمجھی جاتی ہے۔ مغربی ماہرین لسانیات اس کی لسانی صلاحیتوں کے معترف ہیں اور جدید لسانیات کے مطالعے میں اس سے مدد لے رہے ہیں۔ اس نے الفاظ کے تجزیے میں صفر Zero elements کا تصور پیش کیا ہے جو مغرب کے ماہرین کے لئے حیران کن بات ہے۔ وہ اس کا ترجمہ کرکے اس سے زبان کے مطالعے میں استفادہ کر رہے ہیں ہم میں سے کتنے ہیں جنہوں نے اس کا نام بھی سنا ہو گا۔ قائداعظم یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے مجھے بتایا کہ یونیورسٹی

میں ایک لیکچرار کی اسامی کے لئے ایک امیدوار سے سوال کیا گیا کہ پاکستان کے شمالی علاقے Northern Areas کی کسی دو زبانوں کے نام بتائیں۔ وہ امیدوار حیرانی سے منہ تکتا رہا۔ قصور کس کا ہے؟ طالب علم کا ہمارے اساتذہ کا، ماہرین تعلیم کا یا ارباب حل وعقد کا؟ یہ ایک اہم سوالیہ نشان ہے۔

بلاشبہ ہماری زبان ایک معیاری اور ترقی یافتہ زبان ہے۔ ذخیرہ ادب کے لحاظ سے بھی اور ذخیرہ الفاظ کے اعتبار سے بھی صرفی، نحوی اعتبار سے بھی، اور رسم الخط کے اعتبار سے بھی۔ ہر زبان کا ایک تہذیبی رشتہ ہوتا ہے۔ جس سے وہ منسلک رہتی ہے۔ اس کے الفاظ و آہنگ اسی کے تابع ہوتے ہیں ہماری قومی زبان اپنی وسعت و رفعت کے لحاظ سے بھی اور تہذیبی ورثے کے اعتبار سے ایک اعلیٰ اور ارفع زبان ہے۔ اس کی آبیاری میں ہماری اپنی شناخت ہے۔

## فاضل مقالہ نگار و شعرائے کرام کی خدمت میں

ہم اپنے معزز لکھنے والوں سے ملتمس ہیں کہ سہ ماہی الاقرباء میں چونکہ ایسے غیر مطبوعہ مضامین نظم و نثر کی اشاعت ہمارا مدعا ہے جو تخلیقی (Creative) ہوں یا تحقیقی (Research Oriented)۔ اس لئے اس ضمن میں آپ کے گراں بہا تعاون کے لیے ادارہ آپ کا تہہ دل سے ممنون ہوگا۔

## تعاون کیلئے التماس

ہم اپنے محترم قلمی معاونین سے ملتمس ہیں کہ وہ اپنی نگارشات نظم و نثر یا تو ٹائپ شدہ صورت میں ارسال فرمائیں یا ذرا زیادہ احتیاط سے تحریر کردہ ہوں۔ تاکہ پڑھنے میں دشواری نہ ہو کیونکہ ہماری انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ ''الاقرباء'' کے مندرجات اغلاط سے پاک ہوں اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہمیں آپ کا گرانقدر تعاون حاصل ہو۔ (ادارہ)

محمد شفیع عارفؔ دہلوی

# قدیم دلّی۔۔۔ تاریخ کے جھروکے سے

دلّی اینٹ گارے اور پتھر کے تودوں کا نام نہیں تھا بلکہ یہ عبارت تھی ان لوگوں سے جن کے متعلق کبھی میر نے فرمایا تھا ''دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصوّر تھے۔ جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی۔'' ویسے بھی دلی بہت سی حکومتوں کا پایہ تخت ہی نہیں بلکہ علم وادب کا گہوارہ اور تہذیب وتمدن کا مرکز رہی ہے۔

ناچ گانے کی محفلوں کا رواج ہندوستان میں بہت قدیم ہے۔ ایک زمانے میں جب ہندوستان میں مسلمانوں کا نام ونشان بھی نہیں تھا اس وقت بھی ہندو راجہ مہاراجاؤں کے محلوں اور درباروں میں ناچ گانے کی محفلیں سجائی جاتی تھیں مگر ان کا وجود قدرے مختلف تھا۔ لیکن ان محفلوں کو عروج سلطنت مغلیہ کے دور میں نصیب ہوا۔ اور گنجفہ، چوسر، رقص وسرود اور شعر وسخن کی محفلیں مقامی تہذیب کا ایک حصہ بن گئیں اور ان کی جڑیں اتنی مستحکم ہوئیں کہ پھر یہ محفلیں شاہی محلوں اور درباروں سے نکل کر نوابوں اور رئیسوں کی حویلیوں تک آ پہنچیں۔

حسن، اخلاق اور موسیقی تینوں ہی طلسم ہیں اور اگر یہ تینوں چیزیں اتفاق سے ایک ہی جگہ جمع ہو جائیں تو قیامت کا روپ دھار لیتی ہیں۔ اس زمانے میں طوائفیں تعلیم یافتہ، با اخلاق اور اس دور کا ایک اہم کردار سمجھی جاتی تھیں، پوری زندگی موسیقی کے حصول میں گزار دیتیں۔ تب جا کر کہیں یہ مقام حاصل ہوتا کہ جب راگ چھیڑتیں تو لوگ سُن ہو جاتے۔ پتھر کے بن جاتے۔ ہجوم جلوہ سے آنکھیں خیرہ ہو جاتیں اور راگ کے مدھر سروں میں سننے والا مدہوش ہو جاتا۔ اور جو کچھ پاس ہوتا نچھاور کر دیتا۔ ہر چند کہ طوائفوں سے گانا سننا۔ رقص وسرود کی محفلیں سجانا اسلامی تہذیب کے صریحاً خلاف ہے مگر اس کے باوجود یہ محفلیں قدیم تہذیب کا ایک حصہ سمجھی جاتی رہی ہیں جن کا اس زمانے میں بکثرت رواج تھا۔ اس دور کی طوائفیں اہل فن تھیں اور اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھیں لوگ فن موسیقی سے واقفیت رکھتے تھے۔ فن کی قدر کرتے تھے۔ ان میں سے بیشتر کسی نہ کسی نواب یا رئیس سے وابستہ ہوتی تھیں یا ان کے نکاح میں ہوتی تھیں مگر ان کو یہ اجازت ہوتی کہ وہ ریاض جاری رکھیں۔ فن کی خدمت کرتی رہیں۔ اس کو معراج پر پہنچائیں۔ نواب صاحب ان کے جملہ اخراجات

کے کفیل ہوتے۔ جب گانا سننے کو دل چاہا اپنی مخصوص مطربہ کو بلا بھیجا۔ دوست احباب جمع ہو جاتے اور بزم موسیقی آراستہ کی جاتی۔ ایسے راگ راگنیاں سننے میں آتیں کہ لوگ عش عش کرتے رہ جاتے۔ خیال میں بلمپت ہو یا درت یا ترانہ۔ سب پر بلا کی دسترس اور قدرت۔ پھر دادرا۔ ٹھمری' راگ درباری بسنت۔ مالکوس۔ جے جے ونتی۔ بہار۔ آساوری۔ بھیرویں۔ دیپک مہار۔ غرض جس راگ کو چھیڑا اس کا حق ادا کر دیا اور جاننے والے سمجھنے والے مر مٹے۔ اس کے علاوہ نرت کا کیا کہنا۔ محفل پر سکوت۔ سننے والے محوِ حیرت۔ صرف واہ واہ اور سبحان اللہ کے دلکش الفاظ عالم بے خودی میں فضائے بسیط کا سینہ چیرتے ہوئے سنائی دیتے۔ گلوکارہ پسینہ میں شرابور ہو جاتی۔ دہکتا ہوا جوان جسم اور رنگ روپ مزید نکھر جاتا۔ فضا خوشبو سے مہک اٹھتی۔ لوگ دیوانہ وار نثار ہوتے۔ نواب صاحب خوش ہو کر گلوکارہ کا منہ موتیوں سے بھر دیتے۔ زر و جواہر۔ موتیوں کی مالا۔ طلائی کنگن بیش بہا ہیرے کی انگشتریاں اور نہ جانے کیا کیا نذر کرتے۔ مغنیہ اپنی جگہ سے اٹھتی۔ نواب صاحب کی خدمت میں آداب بجالاتی اور اس کے بعد حاضرین محفل حسب حیثیت نذرانہ پیش کرتے۔

یہ گلوکارائیں یہ زہرہ جبینیں۔ نام کی طوائفیں تھیں مگر مہذب اور شائستہ۔ علم مجلسی کا یہ عالم کہ بہت سے امراء اپنے بچوں کو علم مجلسی سیکھنے کیلئے ان کے پاس بھیجتے اور وہ بچے تہذیب و شائستگی اور آداب محفل سیکھتے۔

یہ نواب اور رئیس بڑی آن بان کے مالک تھے۔ حویلیوں جاگیروں' پرگنوں اور زمینوں کے مالک تھے دولت کی فراوانی تھی۔ جہاں یتیم خانوں' مدرسوں' بیواؤں اور یتیموں کو باقاعدہ وظیفے بھیجے جاتے۔ وہاں گھوڑ سواری۔ رقص و سرود اور شعر و سخن کی محفلیں سجائی جاتیں۔ مگر سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد ہندوستان میں انگریزوں کا اقتدار جس قدر بڑھتا گیا اس تہذیب کے خد و خال اسی قدر دھندلے پڑتے گئے۔ رقص و سرود اور شعر و ادب کی محفلیں محدود ہوتی گئیں۔ نوابوں اور رئیسوں کی دولت جواب دینے لگی۔ جاہ و جلال سمٹتا اور فکر معاش بڑھتا گیا۔ اہل دہلی اور ارباب ذوق کیلئے اس صورت حال میں اس تہذیب و تمدن کو برقرار رکھنا مشکل ہو گیا۔ چنانچہ اس کے بعد یہ پشتینی طوائفیں نوابوں اور رئیسوں کی محفلوں سے نکل کر بازار حسن (چاوڑی بازار دہلی) کے خوبصورت بالا خانوں میں منتقل ہو گئیں۔ یہ پری زادیاں۔ فن کی متوالیاں۔ دن میں استادوں سے ریاض کرتیں اور شب میں محفل موسیقی آراستہ کرتیں۔ اہل ذوق اور گانے کی رسیا آتے اور گانا سنتے بیلیں (نذرانہ) پیش کرتے اور رخصت ہو جاتے۔ شب گئے تک یہ سلسلہ جاری رہتا مگر کیا مجال کہ کوئی غیر شائستہ یا تہذیب سے گری ہوئی بات کر جائے۔ یہ طوائفیں جسم فروش نہیں تھیں بلکہ فن کا مظاہرہ کرتی تھیں۔ جس سے

جس کا تعلق ہے یا جو جس سے وابستہ ہے بس اسی کی ہے۔ کیا مجال کہ کوئی دوسرا اس کو میلی آنکھ سے دیکھ سکے وفا کا یہ عالم کہ جس رئیس سے وہ وابستہ ہے اس کے خاندان کا کوئی فرد اس کی محفل موسیقی میں قدم رکھ سکے۔ اگر کوئی بھولے بھٹکے آ گیا۔ تو اس کو نہایت عزت سے بٹھایا اور تخلیہ میں اس کو سمجھایا کہ میاں! یہ محفل آپ اور آپ کے خاندان کے شایان شان نہیں ہے۔ اگر گانا سننے کا شوق ہے تو حکم کریں ہم خود آپ کی محفل میں حاضر ہو جائینگے۔

راقم اس بحر کا شناور نہیں ہے مگر کچھ دن ہوئے میں نے اپنے ایک دوست سے جو خود دہلی کے ایک پشتینی نواب خاندان کے چشم و چراغ ہیں دلی کی قدیم طوائفوں اور ان کے کردار کے متعلق دریافت کیا۔ تو موصوف نے ایک آہ سرد بھری اور فرمایا او میاں کیا ذکر لے بیٹھے۔ جن خواتین کو آج طوائف کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ان کا اطلاق اس دور کی طوائفوں پر ہرگز نہیں کیا جا سکتا۔ آج کل طوائفیں بناؤ سنگھار اور لباس پر زور دیتی ہیں۔ صورت ناز و انداز اور عشوہ و ادا پر عشق کی بساط بچھاتی ہیں۔ مگر جوانی چند روزہ ہے جب یہ ڈھل جاتی ہے نشہ اتر جاتا ہے تو کوئی نہیں پوچھتا۔ مگر اس کے برعکس اس دور کی طوائفیں دیدہ زیب اور جامہ زیب تھیں۔ فنکار تھیں جو عمر کے ساتھ نکھرتا جاتا تھا اور بڑھاپے میں بھی قدر و منزلت کم نہیں ہوتی تھی۔ ان کو صرف اسلئے طوائف کا نام دیا گیا تھا کہ وہ بازار حسن میں اپنے کمروں اور کوٹھوں پر گانے کے فن کا مظاہرہ کرتی تھیں۔ ریاض کرتی تھیں۔ استاد آتے اور فن موسیقی کی تعلیم دیتے ان میں تماشبین' شوقین اور گانے کے رسیا بھی اپنے ذوق کی تسکین کے لیے آ جاتے۔ مگر کیا مجال کہ کوئی ناشائستہ بات یا بیہودہ کلمہ زبان پر لا سکیں۔ اس دور کی طوائفیں جسم کی تجارت نہیں کرتی تھیں۔ اب فن تو رہا نہیں جس کا مظاہرہ کیا جائے البتہ جسم ہے حسن ہے جوانی ہے اس کا سودا کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ نوابزادے خاموش ہو گئے۔ پھر جب میں نے اصرار کیا تو یوں گویا ہوئے کہ میاں! آپ نے تو شبانہ بی بی کو نہیں دیکھا۔ یہ دلی کی مشہور طوائف دونی جان کی صاحبزادی تھیں اور نواب موسیٰ خاں کی اولاد۔ دونی جان۔ بی داراں صاحب کی پرنواسی تھیں۔ بی داراں صاحب حضور بہادر شاہ کے دربار کی گائک تھیں۔ فرمانے لگے شاید آپ کو لفظ "صاحب" پر کچھ اعتراض ہوا ہو۔ مگر میرے میاں! اس دور میں طوائفوں کو "صاحبہ" نہیں کہا جاتا تھا بلکہ "صاحب" کہتے تھے۔ اور یہ ایک امتیازی انداز تھا جس کو جاننے والے جانتے تھے اور سمجھنے والے سمجھ لیتے تھے۔ دونی جان کا بس میں نے بڑھاپا دیکھا ہے۔ قدرے پستہ قد تھیں تاہم قیامت کی حسین یہ وہی دونی جان ہیں جن کے لیے مرزا چپاتی مرحوم نے فرمایا ہے۔

گھستے گھستے ہوگئی ایسی ملت　　　　ساتِ پیسے کی دونی رہ گئی

پھر نواب صاحب نے فرمایا ''نوشابانہ بی بی کو جب میں نے دیکھا تو ان کی جوانی ڈھل چکی تھی اور ایک عرصہ سے کسی صاحب کے نکاح میں تھیں ہر چند کہ مرحومہ طوائفوں کے خاندان کی تھیں مگر عجب کردار اور عجب فن کی مالک تھیں۔ وہ ڈیرہ دار تھیں اور صرف اپنے گھر پر گاتی تھیں لیکن کسی سے کچھ لیتی نہ تھیں بلکہ اگر کوئی صاحب کچھ پیش کرتے تو بڑے طریقہ اور قرینہ سے انکار فرما دیتیں۔ پھر موصوف نے وفورِ غم کے عالم میں فرمایا ''میرے دل میں اس لحمہ بھی مرحومہ کا یہ مقام ہے کہ بغیر بی بی کے ان کا نام نہ زبان پر آتا ہے اور نہ قلم پر۔ یہ وہ حقائق ہیں جواب تک میرے سینہ میں راز تھے اور شاید میرے ساتھ ہی دفن ہو جاتے مگر اب جب آپ نے یہ ذکر چھیڑ ہی دیا ہے تو چاہتا ہوں کہ آپ سن لیں اور عوام تک پہنچا دیں تا کہ حق ادا ہو جائے اور لوگ ان طوائفوں سے نہ صرف واقف ہوں بلکہ دورِ حاضر کی طوائفوں سے موازنہ کریں اور دیکھیں کہ وقت کے ہاتھوں کیا انقلاب رونما ہوا ہے۔''

پھر نواب صاحب نے فرمایا ''جب میری شادی ہوئی تو نوشابہ بی بی کا کمرہ جامع مسجد دہلی کے عقب میں (موٹر کباڑیوں کے مکانوں کے اوپر تھا) وہ کسی نواب کے نکاح میں تھیں۔ لیکن ریاض جاری تھا۔ بعد مغرب استاد آتے اور یہ ریاض کرتیں۔ جو سننا چاہتے آ جاتے۔ ان کی تواضع کی جاتی اور اگر کوئی کچھ نذر کرنا چاہتا تو بڑے سلیقے اور ادب سے پیش کر دیتا۔ دلی میں صرف دو گھرانے ایسے تھے جہاں وہ جا کر گاتی تھیں۔ ایک تو نواب صاحب موصوف کا اور دوسرا پنڈت بزاز کا گھر (جن کی کپڑے کی دکان گھنٹہ گھر کے قریب نئی سڑک پر تھی) ایک دن نواب صاحب موصوف کے گھر پر محفل تھی۔ یہ اس دور کی بات ہے جب ریڈیو اسٹیشن دہلی میں نیا نیا قائم ہوا تھا۔ پٹنہ کے سر سلطان احمد مرحوم انفارمیشن ممبر تھے وہ بھی اس محفل میں شریک تھے نواب صاحب کے قریبی دوست مسٹر شیوراج بہادر سر سلطان کے قریب بیٹھے تھے۔ نواب صاحب قدرے دور تھے۔ نوشابانہ بی بی گا رہی تھیں استاد گھسیٹا خاں سنگت کر رہے تھے۔ گھسیٹا خان مرحوم مشہور سارنگی نواز استاد بندو خان کے چچا تھے اور اپنے فن میں طاق۔ بہر حال نواب صاحب موصوف نے دیکھا کہ سر سلطان نے شیوراج بہادر سے کچھ سرگوشی کے انداز میں فرمایا اور پھر اپنی نشست سے اٹھ کر نوشابانہ بی بی کے پاس آئے اور ریڈیو اسٹیشن پر گانے کی پیش کش کی۔ بی بی نے سر سلطان کو مخاطب کرتے ہوئے عرض کیا ''کہ سرکار میرے لیے بس اتنا ہی کافی ہے کہ آپ جیسے محترم اور صاحب ذوق مجھے سن لیتے ہیں۔ ریڈیو پر گا کر کیا کرونگی'' سر سلطان نے

فرمایا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کے فن سے زیادہ سے زیادہ افراد لطف اندوز ہوں۔ بی بی نے مسکرا کر معذرت پیش کی۔ سر سلطان کی طرف سے اصرار ہوا مگر بے سود۔ آخر اس گریز کی وجہ دریافت کی۔ بی بی نے مجبور ہو کر کہا "عرض کی جرأت نہیں کر سکتی۔ غلط بیانی کی عادت نہیں ہے۔ حق گوئی ممکن ہے ناگوار خاطر ہو۔" مگر سر سلطان ٹلنے والے کب تھے۔ وجہ دریافت کرنے پر مصر رہے۔ جواباً عرض کیا "خطا معاف۔ وہاں اخلاق، ادب اور تمیز داری کی کمی ہے (ان کا اشارہ ایک خاص شخصیت کی جانب تھا (جواب مرحوم ہو چکے ہیں) لوگ اقتدار اور منصب کے زعم میں حد ادب سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ عزت نفسی کا تقاضا یہ ہے کہ وہاں جانے سے گریز کیا جائے"۔ یہ کہہ کر میرے دوست نواب صاحب خاموش ہو گئے۔ مگر میں کب چوکنے والا تھا۔ میں نے نواب صاحب سے پھر درخواست کی۔ قدرے توقف کے بعد انہوں نے فرمایا۔ میاں! میری شادی ہو چکی تھی۔ ایک دن صبح ہی صبح میرے ایک دوست تشریف لائے۔ ان کا کچھ کام تھا جس سلسلہ میں نوشابہ بی بی مدد فرما سکتی تھیں انکار نہ کر سکا۔ ان کے ساتھ ہو لیا۔ یہ زندگی کا پہلا اتفاق تھا کہ میں نوشابہ بی بی کے گھر گیا۔ دوپہر کو جب گھوم گھام کے گھر پہنچا تو نوشابہ بی بی میری اہلیہ کے پاس بیٹھی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی فرمایا "میاں آج آپ جس کام کیلئے تشریف لائے تھے اس کی تکمیل ہو گئی ہے۔" میں نے (نواب صاحب نے) کہا معاف فرمائیں آپ صرف یہ اطلاع دینے تشریف نہیں لائیں بلکہ میری بیوی کو یہ بتانے آئی ہیں کہ آج آپ کے میاں میرے گھر آئے تھے۔ وہ مسکرا کر خاموش ہو گئیں۔

یہ انداز تھا ان طوائفوں کا ان خاندان کے بچوں کے ساتھ جن کے آباؤ اجداد سے ان کے مراسم تھے یا آنا جانا تھا تا کہ وہ بچے بری صحبت اختیار نہ کر سکیں اور اہل خانہ ان کی حرکات وسکنات سے باخبر رہیں یہ انداز تھا ان قدیم طوائفوں کا۔ مگر وہ اقدار سب مٹ گئیں سب فنا ہو گئیں۔

پھر نواب صاحب نے فرمایا۔ افسانہ از افسانہ می خیزد۔ دونی جان صاحب مرض الموت میں مبتلا ہوئیں تو وصیت نامہ لکھوانے کا ارادہ کیا۔ اس پر اشارتاً نواب صاحب موصوف کے والد ماجد (بڑے نواب صاحب) سے گواہی چاہی۔ بڑے نواب صاحب کے احباب نے سخت مخالفت کی کہ وصیت نامہ پر آپ کے دستخط نہیں ہونے چاہئیں۔ آپ کی حیثیت کے خلاف ہے۔ کل کلاں کو معاملہ کچہری میں گیا تو بڑی سبکی ہو گی مگر قبلہ نواب صاحب کو خدا غریق رحمت کرے کسی کی نہ سنی اور نہ صرف اس پر خود دستخط ثبت کیے بلکہ چھوٹے نواب صاحب کو بھی اپنے ہمراہ لے گئے تا کہ اگر ضرورت ہو تو ان کے بھی دستخط ہو جائیں۔ یہ سب کچھ حفظ

ماتقدم کے طور پر کیا گیا تھا کیونکہ بزرگوں کی زندگی کا کیا اعتبار۔ پتہ نہیں نفس کی آمد وشد کا سلسلہ کب منقطع ہو جائے اسلئے کسی جوان آدمی کے دستخط لازمی ہونے چاہئیں۔ اور دوستوں سے کہا کہ ''میاں تعلقات نبا ہے جاتے ہیں گریز کرنا کردار کی کمزوری ہے'' اللہ اللہ کیا لوگ تھے۔ یہ تھی خاندانی نجابت وشرافت' پاکیزگی اور تعلقات کی اہمیت۔ آج دنیا ہے اور مطلب اور پھر کون کسی کا۔

راقم نے بڑے نواب صاحب قبلہ کو دیکھا ہے سبحان اللہ۔ بڑھاپے میں رنگ روپ کا یہ عالم تھا جیسے میدہ اور شہاب۔ پان کھائیں تو سرخی جھلکے۔ مناسب قد۔ سڈول جسم۔ نہایت تکھیے نقش ونگار۔ خوبصورت چمکدار آنکھیں جیسے کسی نے ہیرے کی کنی کوٹ کر بھر دی ہو۔ سپید ریش مبارک۔ ہمیشہ زرق برق لباس (انگرکھا) زیب تن فرماتے تھے بات کریں تو پھول جھڑیں۔ نہایت شکیل ووجیہ۔ چہرہ پر مردانہ وقار۔ ایک خوبصورت دلکش سراپا۔ ہر حیثیت سے نواب نہایت مخیّر۔ ہمدرد جو ضرورت مند آتا خالی ہاتھ نہ لوٹتا۔ ایک بہت بڑی جائیداد کے مالک مگر غرور وتکبر نام کو نہیں۔ انکسار عاجزی خوش خلقی ان کی فطرت تھی۔ اللہ اکبر کیا لوگ تھے۔ کیا وضع داری تھی اب نہ وہ لوگ ہیں اور نہ وہ زمانہ ہاں تو جناب میں نوشابہ بی بی کا ذکر خیر کر رہا تھا نواب صاحب نے فرمایا۔ مجھے ان کے فن کی دسترس یا کمال فن کا ایک اور واقعہ یاد آ گیا۔ سن لیجئے۔ یہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ دلی میں روزانہ مختلف قسم کی پارٹیاں منعقد ہو رہی تھیں میسرز پائنیر آرمس کمپنی کے مالک جان بہادر وجیہہ الدین مرحوم نے "Wenger" میں (George Marriel) ''جارج میریل'' کے اعزاز میں "Tea Party" کا اہتمام کیا تھا۔ بینڈ کوئی مغربی دھن بجا رہا تھا۔ میں (نواب صاحب) اور جارج میریل ایک ہی میز پر بیٹھے تھے۔ نواب صاحب نے فرمایا کہ مغربی موسیقی سے مجھے کوئی لگاؤ نہیں میریل نے برجستہ کہا۔ یہی کیفیت اور تاثر میرا مشرقی موسیقی کے سلسلہ میں ہے۔ نواب صاحب نے فرمایا کسی دن غریب خانہ پر تشریف لائیں میں اپنی پسند کی موسیقی سنواؤں گا۔ پھر کوئی رائے قائم کیجئے گا۔ چنانچہ دن اور تاریخ کا تعین ہو گیا۔ میریل اس سے قبل نواب صاحب کے دولت کدہ پر تشریف نہیں لائے تھے اس لیے مقررہ وقت پر (نواب صاحب نے کہا) میں خود اپنی گاڑی لے کر میریل کو لینے چلا گیا۔ راستہ میں میں نے تذکرۃً میریل سے کہا میں گانے والی کے فن کا ضامن ہوں۔ حسن وجمال کا نہیں اس پر اس نے جواب دیا'' ویل نواب صاحب!'' ''ہم حبشیوں کا گانا بھی سنتے ہیں'' بہرحال جب نواب صاحب میریل کو لے کر گھر آئے تو محفل شروع ہوئی۔ دو چار غزلوں کے بعد نواب صاحب نے ''نرت'' کی فرمائش کی۔ نوشابہ بی بی نے جو فن

موسیقی کی ایک قیامت آفرین شخصیت کی مالک تھیں ایک ہی بول۔ایک ہی مصرعہ کو۔ایک ہی شعر کو"بہیاں پکڑوں، پاؤں دباؤں، بلما سمجھتا نا ہی کیسے سمجھاؤں بلما بڑا ناداں"
جن جن طریقوں اور جن جن اداؤں سے ہاتھ کے اشارہ سے سمجھا کر۔بتا کر (ایک نوعمر صاحبزادہ کو سامنے بٹھا کر جو خود نواب صاحب کا بیٹا تھا) ایسی نرت کی۔ایسی دلنواز انداز میں ادائیگی کی۔بار بار دہرایا اور اپنے فن کا ایسا کمال پیش کیا کہ لوگ چیخ اٹھے۔محفل میں ایک ہلچل مچا دی۔لوگ ہر ادا پر نثار ہوتے نظر آرہے تھے۔میریل کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔جب محفل ختم ہوئی۔برخواست ہوئی تو میریل نے کہا "نواب صاحب آپ نے فرمایا تھا کہ میں گانے والی کے حسن وصورت کا ذمہ دار نہیں ہوں مگر وہ تو خوبصورت بھی ہے۔جب اس نے Acting کی تو میں اس پر عاشق ہو گیا صورت اور فن دونوں میں بہترین ہے اور میں یقین کیجیے مشرقی موسیقی اس کی دھن ساز اور فنکار کی ادائیگی کا قائل ہو گیا"۔
پھر نواب صاحب نے فرمایا میرے جس بچے کو سامنے بٹھا کر نوشابہ بی بی نے نرت کی تھی وہ واقعی اس بچہ سے بڑا پیار کرتی تھیں۔ایک دن مجھ سے فرمانے لگیں۔اس بچہ کی شادی پر اگر میں زندہ رہی (ہر چند کہ میں اس وقت اپنی عمر طبعی کو پہنچ چکی ہوں گی) مگر ایسا فن پیش کرونگی کہ اہل محفل حیرت زدہ رہ جائینگے۔میں نے بہت عرصہ سے پشواز پہننا بند کر دی ہے مگر اس دن پہنوں گی۔یہ کہہ کر نواب صاحب کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔اور پھر ایک لمحہ کیلئے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کہیں دور۔بہت دور ماضی کی حسین گلپوش وادیوں میں گم ہو گئے ہوں۔ پھر نواب صاحب جیسے کسی خواب سے چونک اٹھے ہوں۔فرمانے لگے "مادر چہ خیالیم وفلک در چہ خیال" ان صاحب زادہ کی شادی پاکستان میں ہوئی۔اور انتہائی سادگی سے۔اس موقع پر مرحومہ مجھے بہت یاد آئیں مگر ان کا کوئی پتہ نشان نہ تھا۔پھر اچانک ان سے ایک دن لاہور میں پہلی اور آخری بار ملاقات ہوئی۔وہ کراچی سے لاہور آئی ہوئی تھیں۔معیادی بخار سے اٹھی تھیں اسلئے بہت کمزور تھیں۔پھر نواب صاحب نے فرمایا میں نے ان سے فرمائش کی کہ جناب جگر مرحوم کا وہ شعر سنا دیں جس کا مصرعہ تھا" تجھے دیکھنا ہے تو دیکھ جا کہ خزاں ہے اپنی بہار پر"۔نوشابہ بی بی کے فن کی کیا تعریف کیجائے۔بے شمار ایسے واقعات ہیں کہ جہاں بڑی بڑی محفلوں میں انہوں نے فن موسیقی کی ایک سرو قامت شخصیت کی حیثیت سے بڑے بڑے اساتذہ سے خراج تحسین حاصل کیا۔"کہاں تک سنو گے کہاں تک سناؤں"۔ان قدیم طوائفوں کا کیا کہنا۔صوم وصلواۃ کی پابند تھیں۔سلائی کرتیں اور حاصل کردہ رقم سے نیاز نذر کرتیں۔محرم الحرام اور رمضان المبارک کا تقدس اور

احترام واجب۔ کیا مجال کہ موسیقی آراستہ ہو۔ پھر نواب صاحب نے فرمایا ایسی بہت سی عظیم طوائفوں کے واقعات مجھے معلوم ہیں۔ ایک فلم ہے اور وہ بھی مسلسل۔ جو نظروں کے سامنے سے فانوس خیال کی طرح گزر رہی ہے اور گزرتی رہتی ہے۔ کہاں تک سناؤں۔ کبھی کبھی گزرا ہوا زمانہ۔ چھوڑی ہوئی منزلیں۔ اور بچھڑے ہوئے احباب اتنی شدت سے یاد آتے ہیں کہ زندگی ایک بوجھ اور بار معلوم ہونے لگتی ہے۔ ایک دن آئے گا جب یہ بوجھ بھی اتر جائے گا۔ ہستی معدوم ہو جائے گی شیرازہ ہستی بکھر جائے گا۔ سارا وجود ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ اور وہ بھی اس طرح کہ اس کو سمیٹنے والا کوئی نہ ہوگا۔ اس لئے کہ یہاں کی ہر چیز فانی ہے۔ موت کا مزا چکھنا ہے۔ بقاء اور دوام صرف اس ذات پاک کو ہے جو خالق کائنات ہے۔ مالک ارض وسما ہے۔ جو ہر شے پر قادر ہے۔ جو ہمیشہ سے تھا اور ہمیشہ رہے گا۔

# مکتبہ اتحاد المصنفین کی مطبوعات

| نام کتاب | موضوع | مصنف / مولف | سال اشاعت | قیمت |
|---|---|---|---|---|
| دبستان قابل | سوانح۔ انتخاب کلام (مرتبہ منصور عاقل) | قابل گلاؤٹھوی | ۲۰۰۰ء | ۵۰۰ روپے |
| گلاؤٹھی | تاریخ (جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں استعمار کے خلاف سادات گلاؤٹھی کا مزاحمتی کردار) | منصور عاقل | ۱۹۹۸ء | ۲۵۰ روپے |
| حرف محرمانہ | شخصیت۔ فکر وفن (حدیث خودنوشت و حدیث دیگراں) | منصور عاقل | ۱۹۹۵ء | ۲۰۰ روپے |
| گہوارۂ سخن | شعری مجموعہ | منصور عاقل | ۱۹۹۳ء | ۲۰۰ روپے |
| برگِ سبز | مکتب داغ کے نورتن سید عبدالوحید فدا گلاؤٹھوی کے فکروفن پر تنقیدی جائزے | منصور عاقل | ۱۹۹۲ء | ۲۰۰ روپے |
| حرف بہ حرف (شائع کردہ اردو اکادمی۔ بہاولپور) | نقد و نظر (مضامین ومقالات اضافہ کے ساتھ) | منصور عاقل | ۱۹۸۱ء | اشاعت ثانی (زیر ترتیب) |

ملنے کا پتہ مکان نمبر ۱۳ اسٹریٹ نمبر ۱۳ سیکٹر ایف ۲/۷ اسلام آباد

ڈاکٹر عطش درّانی

# اقبالیات کا تحقیقی منہاج

ڈاکٹر گیان چند نے اپنی کتاب ''تحقیق کا فن'' میں اقبالیات پر تحقیق کو جو شک کی نگاہ سے دیکھا ہے وہ ایسا بھی نہیں کہ اسے محض ایک بھارتی مفکر کی رائے کہہ کر نظر انداز کر دیا جائے۔ پشاور یونیورسٹی کے ادبی تحقیق سیمینار میں پروفیسر شاہد اقبال کامران نے اپنے مقالے[۲] اور پروفیسر فتح محمد ملک نے اپنے صدارتی خطبے[۳] میں اس طرف بھرپور توجہ دلائی تھی۔

اقبالیات میں تحقیق کی روایت ایک طرح سے شخصی احوال و آثار ہی کی توسیع چلی آ رہی ہے۔ شخصیات پر ایسی تحقیق کا ایک جائزہ (بحوالہ بالا سیمینار) ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے لیا تھا[۴] اور ایک رائے پروفیسر ایس ایم شاہد نے اپنے مقالے[۵] میں دی ہے۔ یعنی احوال و آثار میں اعداد و شمار، بیانات، آراء وغیرہ کو جمع کر دینے سے تحقیقی جواز پیدا نہیں ہوتا۔ یہ محض سوانح نگاری ہے اور سوانح نگاری میں تاریخی تحقیق تو استعمال ہوتی ہے لیکن یہ بذات خود تحقیق نہیں کہلا سکتی۔ پروفیسر نسرین زہرا کی رائے میں ''اردو کے اہل تحقیق کے علمی مقام پر کوئی شبہ نہیں ہو سکتا لیکن جب تک وہ اپنے مقالے کو تحقیق کے اصولوں کے مطابق نہیں لکھیں گے وہ تحقیقی مقالہ نہیں کہلائے گا۔ اس کے علمی پائے سے انکار ضروری نہیں۔ تحقیق کا اصول اپنا ایک ڈسپلن رکھتا ہے اگر اس کے مطابق ہے تو تحقیق تحقیق کہلائے گی ورنہ نہیں[۶]۔''

اقبالیات میں تحقیق کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ رائے بے حد اہمیت رکھتی ہے۔ فکر اقبال کا مطالعہ محض ادبی یا لسانی حیثیت نہیں رکھتا، اس کی جڑیں سماجی علوم یا عمرانیات میں زیادہ گڑی ہیں۔ تاریخ، فلسفہ، اخلاقیات، اسلامیات اس پر مستزاد ہیں۔ اقبال کے شخصی احوال بھی تحقیق کے لیے منطقی بنیادوں یعنی استغرائی Inductive اصولوں کی بجائے زیادہ تر استخراجی Deductive بلکہ بہت حد تک علمی ادعا Dogma کی صورت اختیار کرتے چلے جا رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں اقبالیات پر تحقیق دنیا میں استہزاء کا شکار ہو رہی ہے☆۔ بات اقبال پر تحقیق کی نہیں مگر جیسا کہ گیان چند نے لکھا ہے کہ ''ڈاکٹر اقبال کو ایک ولی رحمت

---

☆ بہتر ہوتا کہ فاضل مقالہ نگار اس ضمن میں ضروری حوالے دیتے جن کے بغیر یہ جملہ جملہ معترضہ قرار پاتا ہے (ادارہ)

بنانے کی جو کوششیں ہیں' ان کے علی الرغم تحقیق ان میں انسانی کمزوریوں کا سراغ دیتی ہے۔'' اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ '' پاکستان میں اگر کوئی علامہ اقبال کے خلاف زبان کھولے گا تو اسے برداشت نہیں کیا جائے گا[۸]''۔ میں کہتا ہوں کہ یہاں اگر کوئی اقبال اور اقبالیات کے حق میں بھی لیکن موجودہ جامعاتی تحقیقی روش کے خلاف زبان کھولے گا تو اس کا حشر بھی وہی ہوگا جیسا ۲۰۰۱ میں اقبالیات کی ایک ورکشاپ میں مجھے دیکھنے کو ملا۔

اس ورکشاپ کی بات پھر دہرائے دیتا ہوں کہ اگر محض اقبالیات کے موضوع کے تحت بعض تشریحی مطالب کو فروغ دینا ہے تو ایسے کاموں کے لیے اقبال اکیڈیمی جیسے ادارے کافی ہیں۔ وہ اپنا کام بخوبی انجام دے رہے ہیں اور انہیں کوئی راہ دکھانے کی ضرورت بھی نہیں۔ لیکن اگر اقبالیات کو جامعاتی سطح پر تحقیق کا موضوع بنانا ہے تو جان لیا جائے کہ تحقیق کا آغاز شک' مسئلے' ضرورت اور فرضیوں سے ہوتا ہے۔ فرضیہ تحقیقی سوال کا نام ہے اور سوال تشکیک کی بنا پر پیدا ہوتا ہے۔ گویا اقبالیات کا آغاز ہی شک سے ہوگا اور پھر جو بھی تحقیقی نتائج سامنے آئیں گے' انہیں (ان کی تحقیق منظر عام پر آنے تک) مستند حیثیت حاصل ہوگی۔ خواہ یہ تحقیق علامہ کی ذاتی' شخصی' جنسی یا متاہلی زندگی سے متعلق ہو یا ان کے مذہبی' فکری اور فلسفیانہ عقائد کی بابت ہو۔ ویسے بھی ان موضوعات سے زیادہ عمرانی شعبوں پر اقبال کے اثرات اور تعلق کو موضوع بنانا اہمیت رکھتا ہے۔ چنانچہ اقبالیات میں تحقیق ادبیات سے زیادہ سماجی علوم کے حوالے سے موزوں ہے۔

اگر اقبالیات میں تحقیق اس نہج پر انجام دینا ہے تو اقبالیات کے ایم فل' پی ایچ ڈی کو استوار رکھا جائے اور اگر محض اقبال شناسی کا فروغ مقصود ہے اور ادبی حوالہ قائم رکھنا ہے تو گریجویٹ سطح تک کے کورس کافی ہیں۔ بلاوجہ اور بے جواز اعلیٰ تحقیق کی طرف اٹھائے گئے قدم واپس لے لیے جائیں۔

بات اقبالیات میں تحقیقی منہاج کی ہو رہی ہے تو ایک نظر اس سلسلہ میں وجود میں آنے والے تحقیقی مقالوں پر بھی ڈال لی جائے جو جامعاتی سطح پر وجود میں آتے رہے ہیں۔ ان میں زیادہ تر دستاویزی حوالوں یعنی سوانح حیات' تصانیف' مکاتیب' حواشی اور کتابیات شامل ہیں۔ جہاں تک اقبال کے فکر و فلسفہ کا تعلق ہے' اسے بھی ادبیات کی شاخ کے طور پر برتا گیا ہے۔ ادب کا ماہر ہی فکر' فلسفے' سیاسیات' تاریخ' عمرانیات وغیرہ کا ماہر سمجھا گیا ہے۔ بقول شاہد اقبال کامران اپنے مخصوص اعتقادات کی مماثلتوں سے پیدا ہونے والی عقیدت کے اندر محدود رہنے کا درس ہے[۹]۔ ایسی تحقیق کے نگران بھی اردو فارسی کے اساتذہ ہی مقرر کیے جاتے رہے ہیں شعبہ اردو یا فارسی کے اندر تو اقبالیات پر ایسی تحقیق اپنا پورا پورا جواز رکھتی ہے کہ اسے صرف اردو یا فارسی ادبیات

کے حوالے سے دیکھا جانا ہوتا ہے لیکن جب اقبالیات کے لیے علیحدہ شعبے کا قیام عمل میں آئے تو اس کی حدود ادب سے وسیع تر ہو جاتی ہیں چنانچہ سماجی تحقیق میں مہارت شرط اول ہے اردو فارسی زبانوں میں ۔ بقول پروفیسر نسرین زہرا ''اصول تحقیق کا ابھی گزر کہاں ہوا ہے''[۱] ابھی اردو فارسی کے اساتذہ کو اصول تحقیق کا ماہر کہاں تسلیم کیا جا سکتا ہے' تا آنکہ انہوں نے تحقیق کے ڈسپلن کے مطابق تکنیک میں مہارت حاصل نہ کی ہو۔

تحقیق ایک سائنسی منہاج کا نام ہے۔ اس کا آغاز سائنسی علوم سے ہوا۔ سماجی علوم میں اس کا گزر نفسیات سے ہوا۔ جہاں تھارن ڈائیک سے آغاز کر کے ژان پیاژے تک بہت سے نام گزرتے ہیں ۔ علم التعلیم کے ماہرین نے انہیں تسلیم کیا اور تعلیمی نفسیات سے لے کر تعلیمی عمرانیات تک کو تحقیق کی دنیا میں لے آئے۔ اب سماجی علوم نے تعلیمی ماہرین سے اصول تحقیق سیکھ کر اپنے لیے اصول وضع کر لیے۔ گویا اقبالیات کے شعبے کو بھی وہی تحقیقی منہاج اپنانا ہوگا جس کا حوالہ عمرانی علوم میں آتا ہے اور منزل سائنسی طریق کار ہے، یعنی ایک مکمل تحقیقی لائحہ عمل اور ڈیزائن اپنانے کا نام اقبالیات میں تحقیق ہوگا۔

تحقیق میں محض سابقہ معلومات کو یک جا کر کے صرف نئی ترتیب دے دینا کوئی اہمیت نہیں رکھتا اور اپنی پسند نہ پسند' ادعا' دعویٰ' فرضیہ' یا مفروضہ لازماً ثابت کرنے کے لیے محض اس کے حق میں شواہد جمع کر دینے کا نام تحقیق نہیں ہے جبکہ ہمارے ہاں یہی روایت رہی ہے اور ادبیات' تاریخ اور فلسفہ میں عموماً اسی پہلو سے تحقیق انجام دی جاتی رہی ہے۔ کسی سائنسی تحقیق یا معروضیت کا یہاں گزر نہیں ہوتا۔

اقبالیات کے تحقیقی منہاج کے لیے جس سائنسی اصول کو اپنانا ضروری ہے' وہ اس کے ڈیزائن میں مضمر ہے یعنی۔

۱۔ تحقیقی مقاصد واضح ہوں اور مسئلہ بیان کیا جا سکے۔

۲۔ تحقیقی سوالات متعین ہوں یعنی فرضیے قائم ہو سکیں۔

۳۔ سابقہ تحقیقات سے مکمل آگاہی ہو۔ اس موضوع پر کی گئی تحقیق کا خلاصہ لکھا جائے۔

۴۔ اپنی حدود' طریق تحقیق اور آلات تحقیق سے آگاہی اور جواز موجود ہو۔

۵۔ معروضی تحقیقی ڈیزائن وضع ہو چکا ہو"۔

ان حوالوں سے اقبالیات کے تحقیقی منہاج میں متغیرات اور ان کے تقابل کی تلاش اصل کام ہے۔ یعنی ایسے متغیرات کا باہمی مطالعہ Corelation معلوم کرنا جو عام طور پر استخراجی طریقے سے ہم اپنے ادعا

میں ظاہر کرتے ہیں مثلاً اگر موضوع یہ ہو کہ تحریک پاکستان کے دنوں میں اقبال کے اثرات کن شعبوں پر کس طرح سے تھے اور دورِ جدید میں ان میں کیا تبدیلی آئی ہے تو اس مطالعے میں آبادی، تعلیم، طبقات، ترجیحات اور رجحانات وہ متغیرات ہوں گے جن کے حوالے ہی سے جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ اقبال شناسی کے لیے اردو، فارسی نیز فلسفہ وفکر سے دوری متغیرہ شمار ہوگی۔ اقبالیات کا تحقیقی ڈیزائن کچھ ایسا ہی بنے گا۔

ایک بات جو عام طور پر سماجی علوم کی تحقیق میں نظر انداز کر دی جاتی ہے اور سب سے اہم ہے وہ اس کا جواز اور وثوق یا اعتباریت ہے یعنی اس سوال کا جواب کہ آپ یہ تحقیق کس بنا پر اور کیوں انجام دینا چاہتے ہیں؟ اس کے انجام نہ دینے سے کیا فرق پڑے گا؟ یہ جواب فکری موضوعی نہیں بلکہ معروضی سطح پر مہیا ہونا چاہیے۔ اس کے لیے ضرورت Felt Difficulty کی پیمائش اور اس کی بنا پر پیدا ہونے والے مسئلے کا درست بیان لازم ہے۔ علاوہ ازیں یہ کہ آپ کی انجام دادہ تحقیق پر دوسرے اہل علم کس حد تک اعتبار کریں۔ دستاویزی تحقیق میں اسے ایک مثال سے یوں سمجھا جا سکتا ہے مثلاً ''علامہ اقبال اور ڈیرہ غازی خاں'' ایک کتاب ہے جسے مرتب نے ردی سے حاصل ہونے والے ایک مسودے کی بنیاد پر شائع کیا ہے۔ ہمارے پاس ایسے کوئی شواہد نہیں کہ ہم مرتب کے بیان پر اعتبار کر لیں۔ اصول تحقیق ایسی اشاعتوں کو تسلیم نہیں کرتا۔

اعتباریت کا تعلق تحدید Limitation اور نمونہ بندی Sampling کے فارمولوں سے ہے۔ یعنی تحقیق کار نے شواہد Instances کوائف Data کو کتنے فی صد امکانات اور حدود میں حاصل کیا ہے۔ اس کے برعکس کتنا کچھ ہو سکتا تھا۔ جدید تحقیق تو تجرباتی اور تجربہ گاہی سطح پر کسی نتیجے کو سوفی صد تسلیم نہیں کرتی۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ نتیجہ مثبت منفی ۶۵ +-اعشاریہ پانچ فی صد تک درست ہونا چاہیے۔

تحقیق دراصل معروضی صداقت کی تلاش کا نام ہے اور بقول پروفیسر ایس ایم شاہد معروضیت نے اپنے کچھ پیمانے بنا رکھے ہیں یعنی تحقیق اس وقت تک تحقیق نہیں ہو سکتی جب تک کہ [۱۲]

۱۔ کوئی مسئلہ پیدا نہ ہو۔

۲۔ اس مسئلے کا کوئی حل نظر نہ آ رہا ہو۔

۳۔ یہ حل یا فرضیے جانچے نہ جا سکیں۔

۴۔ نتائج بار بار ایک سے نہ آئیں۔

۵۔ کوائف کی صحت، جواز اور وثوق واضح نہ ہوں۔

چنانچہ کوئی تحقیق نہ تو ان امور کے بغیر مکمل ہو سکتی ہے اور نہ قابل اعتبار۔ اس لیے اقبالیات کے تحقیق کاروں کو یہ سب کچھ سوچ سمجھ کر تحقیق کی دنیا میں قدم رکھنا چاہیے۔ بصورت دیگر اقبال شناسی کا ادبی جائزہ اردو' فارسی کے شعبوں کے اندر ہی لیا جانا چاہیئے۔ ☆

## حوالہ جات


۱۔ گیان چند' ڈاکٹر "تحقیق کا فن" مقتدرہ قومی زبان' اسلام آباد ۱۹۹۴ء (ص ص ۲۹' ۴۰' ۸۴)

۲۔ شاہد اقبال کامران' اقبالیات میں تحقیق' مسائل اور امکانات "اخبار اردو" اسلام آباد اکتوبر ۲۰۰۲ء (ص ۳۱)

۳۔ پروفیسر فتح محمد ملک کے خطبہ کے لیے دیکھیے روداد سیمینار "ادبی تحقیق" "مسائل اور رفتار" کی رپورٹ از عامر سہیل "اخبار اردو" اسلام آباد ستمبر ۲۰۰۱ء

۴۔ مرزا حامد بیگ' ڈاکٹر' شخصیات پر ہونے والی تحقیق" "اخبار اردو" اسلام آباد' اکتوبر ۲۰۰۲ء (ص ۲۹)

۵۔ ایس ایم شاہد' ادبی تحقیق کی معروضیت "اخبار اردو" اسلام آباد' اکتوبر ۲۰۰۲ء (ص ۳۵)

۶۔ نسرین زہرا' پروفیسر فرضیات تحقیق اردو' "اخبار اردو" اسلام آباد' اکتوبر ۲۰۰۲ء (ص ص ۴۹' ۵۰)

۷۔ بحوالہ بالا (ص ۲۹)

۸۔ بحوالہ بالا (ص ۸۴)

۹۔ بحوالہ بالا (ص ۳۱)

۱۰۔ بحوالہ بالا (ص ۴۶)

۱۱۔ تحقیقی ڈیزائن کے لیے میرا مضمون ملاحظہ ہو مطبوعہ "اخبار اردو" اسلام آباد' اکتوبر ۲۰۰۲ء اور خاکے کی تیاری کے لیے ملاحظہ ہو۔ ڈاکٹر محسنہ نقوی کا مضمون "اردو کا تحقیقی خاکہ" "اخبار اردو" اسلام آباد دسمبر ۲۰۰۲ء (۱۴)

۱۲۔ بحوالہ بالا (ص ۳۵)


---

☆ فاضل مقالہ نگار کا یہ جملہ محل نظر ہے۔ قارئین اظہار خیال فرما سکتے ہیں۔ (ادارہ)

طارق ہاشمی

# غالب کی عصرِ حاضر میں مقبولیت

ماہرین غالب نے کلام غالب کے متعدد رجحانات پر اتنا لکھا ہے کہ اپنا قلم اور قارئین کی کمر توڑ دی ہے لیکن اتنا کچھ لکھے جانے کے باوجود غالب کو سمجھنے کی خواہش میں کمی تو کجا اور اضافہ ہوا ہے اور اتنی آوازوں میں خود غالب کی آواز دب گئی ہے۔ غالب پر لکھنے والوں میں سے بیشتر نے غالب کے ہاں موجود رجحانات کے گھنے اور تناور درخت کو لہلہاتے تو دیکھا مگر اس کی جڑوں کی طرف توجہ کی زحمت نہیں کی۔

غالب ہمارے عہد کے مقبول شاعر ہیں اور آثار یہ ہیں کہ عہد آئندہ کے مقبول ترین شاعر ہوں گے لیکن امر واقعہ ہے کہ موصوف اپنے عہد میں نہ صرف نامقبول تھے بلکہ نشانہ تضحیک بھی۔ بعض ناقدین نے متوخر الذکر معاملے کی توجیہ کے طور پر غالب کی مشکل پسندی کے زیر عنوان مضامین کا ڈھیر لگا دیا اور ثابت کیا کہ غالب اتنا مشکل پسند تھا کہ اس کی شاعری لوگوں کی سمجھ میں نہ آتی تھی پھر چونکہ ذوق دربار ظفر میں رسائی حاصل کر چکے تھے اس لیے غالب کی زندگی میں اس کی قدر افزائی نہ ہو سکی اور اسے وہ مقام نہ ملا جو اسے زندگی میں ملنا چاہیے تھا۔

سوال یہ ہے کہ غالب اتنا ہی مشکل پسند تھا اور اس کی شاعری بہت ہی پیچیدہ ہے تو ہمارے عہد سہل پرست میں اس کی مقبولیت کے اسباب کیا ہیں کوئی دوسرا کلاسیکی شاعر (کوئی اور نہ سہی' میر یا مومن ہی سہی جن کی زبان سادہ اور صاف بھی ہے) مقبول کیوں نہ ہو سکا شاعری کی مقبولیت کے حوالہ سے ایلیٹ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اگر کوئی شاعر مسلسل کسی معاشرے میں مقبول ہو رہا ہے تو یہ بات واضح ہے کہ شاعر وہی باتیں کر رہا ہے جو معاشرے کے افراد کے ذہنوں میں پہلے سے موجود ہیں۔

غالب کی اپنے دور میں اپنی عدم مقبولیت کا ایک واضح سبب یہی ہے کہ غالب جو باتیں کر رہا ہے وہ اس کے معاشرے کیلئے قبولیت کے لائق نہیں تھیں وہ جن اقدار کی نمائندگی کر رہا تھا وہ معاشرے کیلئے اجنبی تھیں اسے آپ غالب کی عبقریت یا گہری ذہانت سمجھیے کہ غالب کو ان اقدار کی جھلک اپنے مستقبل کے معاشرے میں صاف نظر آ رہی تھی غالب کا تعلق جن اقدار اور روایات سے تھا ان کی شکست کا نقشہ ان کے سامنے تھا۔ یگانہ پر مضمون لکھتے ہوئے سلیم احمد نے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ:

"غالب کی شاعری میں ہمیں اس انسان کی چند ایسی باتیں اور جھلکیاں نظر آتی ہیں جس کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ غالب کے تخیل نے اس وقت کس طرح دیکھ لیا تھا جب ہمارے ہاں یہ انسان ابھی تاریخ کی گود میں تھا۔"

سلیم احمد تاریخ کی گود میں جس انسان کی بات کر رہے ہیں اس سے واقفیت سے پہلے ایک نظر مشرق کے اس معاشرے پر ڈالتے ہیں جو غالب کی شاعری میں نزع کا شکار نظر آتا ہے۔

یہ وہ معاشرہ تھا جو انسانی تعلقات کے اعتبار سے مربوط تھا۔ اس مربوط معاشرے میں ایک انسان کا دکھ ہر انسان کا دکھ تھا۔ کوئی شخص اپنے رنج میں رنج تنہائی نہیں کھینچتا تھا۔ اس معاشرے میں "انا" نام کی کوئی چیز نہیں تھی میری مراد اس انائے منفی سے ہے جس کے باعث کوئی شخص اپنا دکھ کسی دوسرے شخص حتی کہ اپنے قریبی رشتے کو بھی بتانے سے گریز کرتا ہے مشرقی معاشرے میں انسان دنیا میں سب کچھ اپنی ہستی ہی کو نہیں سمجھتا تھا۔ معاشرہ اس طرز فکر کے بدولت درد آشنا تو تھا لیکن کرب آشنا نہیں تھا۔ کرب درد کی وہ منتہا ہے جہاں انسان خود سے اور حیات و کائنات سے نفرت شروع کر دیتا ہے۔ وہ زندگی پر موت کو ترجیح دیتا ہے۔

مشرق کے اس مربوط معاشرے میں انسان کا انسان سے تعلق کس قدر گہرا تھا اس کی ایک شکل میر کے ان چند سادہ اور زباں زد عام اشعار میں دیکھیں

جو اس شور سے میر روتا رہے گا　　تو ہمسایہ کا ہے کو سوتا رہے گا

---

فقیرانہ آئے صدا کر چلے　　میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

---

وجہ بیگانگی نہیں معلوم　　تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں

---

میر صاحب رُلا گئے سب کو　　کل وے تشریف یاں بھی لائے تھے

---

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ　　برسوں رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

---

لیکن افسوس کہ برسوں یاد رہنے والی باتیں لوگ بہت جلد بھول گئے کہ میر مرا تو چند برس بعد اس کا معاشرہ بھی مر گیا۔

مشرقی معاشرے کی چند اقدار جن کا ذکر اختصاراً اوپر کیا ہے ان کی صورت معکوس اگر ہم دیکھیں تو

انسان کی وہ حالت نظر آجائے گی جس کی طرف سلیم احمد اشارہ کر رہے ہیں۔

''یعنی وہ شہری معاشرہ جو آج تشکیل پا چکا ہے جس میں انسانی رشتے اس حد تک شکستہ ہو چکے ہیں کہ دور موجود کا سب سے مقبول ترین لفظ "Privacy" ہے ہر شخص اپنی پرئیویٹ زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ اسے دوسرے آدمی کی خوشی اور دکھ سے کوئی غرض نہیں ہے۔''

گزشتہ دنوں اپنا مقالہ ''جدید اردو نظم میں تصور انسان'' مکمل کرتے ہوئے جب میں نے جدید شعراء کی نظموں میں انسان کا جائزہ لیا تو میں اس نتیجے پر پہنچا کہ جدید متمدن زندگی ایک ہسپتال کی طرح ہے جس میں ہر طرف مریض ہیں ہر مریض اپنی تکلیف میں کراہ رہا ہے دوسرے مریض کے مرض سے اسے غرض نہیں ہے اور ہر انسان کو ایک مریض کی طرح اپنے بستر سے آگے دنیا نظر نہیں آتی۔

غالب جسے راقم نے اپنے عہد کا مقبول شاعر کہا ہے اس کی مقبولیت کے اسباب یہی ہیں کہ غالب نے جو باتیں کیں وہ عہد موجود کی مقبول باتیں ہیں۔ بدلتی ہوئی اقدار کا شعور جس قدر غالب کے ہاں ملتا ہے معاصرین غالب کے ہاں اس کا شمہ بھی نظر نہیں آتا۔

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے
--------------
ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے
--------------
وہ فراق اور وہ وصال کہاں وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
--------------
مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمہیں وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی
--------------
یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں
--------------

یہی وہ رنگا رنگ بزم آرائیوں والا معاشرہ تھا جو ٹوٹا تو انسان ایک گھمبیر تنہائی کا شکار ہو گیا۔ وہ دوسرے انسان سے ملنے تو کجا اس سے خائف رہنے لگا معاشرے میں اسے دوسروں کا وجود کھٹکنے لگا اس پرائیویٹ معاشرے کی ایک شکل غالب کی اس غزل میں دیکھیے۔

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو ہم نفس کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

کوئی ہم سایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو بے درودیوار سا اک گھر بنایا چاہیئے

اس پرائیویٹ معاشرے میں انسان انسان سے کس قدر خوفزدہ ہے اس کی صورت حال بھی غالب سے سنیئے۔

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد ڈرتا ہوں آدمی سے کہ مردم گزیدہ ہوں

غالب کی شاعری میں انسان سے انسان کی دوامی خواہش صرف زندگی تک نہیں ہے بلکہ وہ بعد از مرگ بھی انسانی تعلق سے لاتعلق نظر آتا ہے اور اگر قدرے تعلق رہ جائے تو یہ اس کیلئے باعث شرم ہے۔

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا نہ کبھی جنازہ اٹھتا ، نہ کہیں مزار ہوتا

-----------

رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم مارا دیار غیر میں مجھ کو وطن سے دور

-----------

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا یہ لاش بےکفن اسد خستہ جاں کی ہے

-----------

مشرقی معاشرے میں عشق ایک بہت بڑی قدر تھا لیکن تہذیب جدید کے مادی اور اقتصادی انداز فکر نے جہاں دیگر روحانی اقدار کو شکستہ کیا وہاں عشق بھی عقلی بیماریوں پر دیکھا جانے لگا۔ نتیجتاً یہ قدر بھی ایک بے معنی بلکہ لایعنی قرار پائی۔

غالب اردو کا وہ پہلا شاعر ہے جس کے ہاں عشق کی بے قدری کا احساس اجاگر ہوتا ہے

عرض نیاز عشق کے قابل نہیں رہا جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

اس شعر میں غالب کا لہجہ بہت حد تک مضمحل ہے لیکن درج ذیل شعروں میں اس طرز فکر کا اظہار وہ بہت حد تک یقین کے ساتھ کر رہے ہیں۔

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

(شعر میں عشق کیلئے "کاروبار" کا لفظ بھی لائق توجہ ہے)

اور پھر یہ شعر!

عشق نے غالب نکما کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

عہد حاضر کی شہری زندگی کے مسائل اور جوہری ہتھیاروں کے خوف کی آمیزش سے جس فلسفہ حیات نے نمو پائی ہے وہ وجودیت (Existentionlism) کا فلسفہ ہے زندگی کے بارے میں یہ طرز احساس دو عظیم جنگوں کے مابین معرض وجود میں آیا۔ وجودیت کے اماموں میں کرکے گوڈ جبریل مارشل، مارٹن

ہائیڈ یگر اور سارتر نمایاں ہیں ان مفکرین نے فلسفہ وجودیت کی مختلف سطحوں پر تشریح کی ہے تاہم ان سب کے ہاں جو قدر مشترک ہے وہ کائنات میں انسان کی بے بسی اور تنہائی ہے زندگی کا انجام کچھ بھی نہیں ہے دنیا ایک بیہودہ مقام ہے اور انسان کا وجود بے معنی اور لغو ہے۔ انسان کا خارجی ماحول انسان کیلئے ایک ایسا جہنم ہے جو اس کی انا سے متصادم ہے وجودی انسان کا زندگی کے بارے میں رویہ بیدل کے اس شعر سے زیادہ واضح ہے۔

زندگی در گردنم افتاد بیدل چارہ نیست　　　شاد باید زیستن' ناشاد باید زیستن

ناقدین غالب نے غالب کے ہاں صوفیوں کے فلسفہ وحدت الوجود پر تو بہت زور دیا ہے لیکن اس کے ہاں وجودی عناصر کی تلاش کا سفر بہت کم ہوا ہے حیرت ہے کہ دیوان غالب کا پہلا شعر ہی وجودی فلسفہ کے عناصر رکھتا ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا　　　کاغذی ہے پیرہن' ہر پیکر تصویر کا

وجودی طرز کے باعث انسانی تعلقات کی شکست و ریخت' تنہائی 'کرب اور مجبوری و بے بسی کا جو احساس جنم لیتا ہے اس کی مثالیں غالب کی شاعری سے اوپر دی گئی ہیں۔ تاہم ذیل کے اشعار اس احساس کی مزید ترجمانی کرتے ہیں

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں　　　موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

----------

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج　　　شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

----------

کلام غالب میں یہ رجحانات ایک گھمبیر حیرانی میں ڈال دیتے ہیں نئے دور کی سوچ انسان کا طرز احساس اور نئے زمانے کی نئی اقدار کا جس قدر گہرا شعور غالب کے ہاں ملتا ہے شاید جدید شعراء کے ہاں بھی ہمیں اس حد تک نظر نہ آئے۔ یہ بات غالب کی شاعرانہ ژرف بینی کا ایک زندہ ثبوت ہے کہ جب انیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں مشرقی اقدار میں دراڑیں پڑنا شروع ہوئیں تھیں تو خود اہل مشرق اس عمل سے بے خبر تھے کہ تاریخ کا یہ عمل ہمیشہ خاموشی سے سفر طے کرتا ہے مگر غالب کو مشرق میں اپنے اقدار کا نقشہ بہت واضح دکھائی دے رہا تھا اور چشم غالب نے جو بات نگاہ تخیل سے اس وقت دیکھی آج وہ بساط ہم نگاہ حقیقت سے دیکھ رہے ہیں اور جب تک یہ نئی اقدار موجود ہیں غالب مقبول ہے اور جب تک رہیں گی غالب کی مقبولیت اور بڑھتی جائے گی کہ جدید دور اور جدید معاشرے کی نفسیات میں غالب کی روح بول رہی ہے۔

سرورانبالوی

# علامہ اقبالؒ کے لئے لکھے گئے اولین مرثیے

علامہ اقبال کا انتقال ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو بروز جمعرات علی الصبح فجر کی اذان کے ساتھ ۵ بج کر ۱۴ منٹ پر ہوا اور اُسی روز انہیں بادشاہی مسجد کے پہلو میں رات ۱۱ بجے سپردِ خاک کردیا گیا

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے　　　سبزۂ نورُستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

ان کا سوگ تمام برصغیر میں منایا گیا ایسی جلیل القدر اور نابغہ روزگار ہستیاں کسی قوم میں صدیوں بعد پیدا ہوتی ہیں ثنائی نے اس حقیقت کو بڑے لطیف اور خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔

عمر ہا باید کشیدن انتظار بے شمار　　　تا زیک جوف صدف باراں شود دُرِ عدن

اس آفتاب علم وحکمت کے غروب ہوتے ہی شعراء نے ان کی یاد میں دردانگیز مراثی اس کثرت سے لکھے کہ ان کا احاطہ مشکل ہے یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ ان کی وفات کی خبر سنتے ہی اخبارات نے ضمیمے اور خصوصی نمبر شائع کئے۔ ان سے متعلق لکھے جانے والے مراثی کا شمار کرنا مشکل بلکہ ناممکن ہے یہاں صرف ان دستیاب مراثی کا تذکرہ مقصود ہے جو اسی روز لکھے گئے یا پھر ان کے سال وفات ۱۹۳۸ء کے دوران لکھے گئے۔ ان کی وفات کے روز یعنی ۲۱ اپریل کو معرض وجود میں آنے والے تلوک چند محروم اور اکبر لاہوری کے دو مرثیے الاقربا کے اقبال نمبر (اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۲ء) اور اپریل تا جون ۲۰۰۳ء میں شائع ہو چکے ہیں ذیل میں دیگر مراثی جو ۱۹۳۸ء میں لکھے گئے پیش کئے جا رہے ہیں۔ ''رجال اقبال'' مرتبہ عبدالرؤف میں ایک قطعہ تاریخ وفات ان الفاظ کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

خواجہ دل محمد کی قومی نظمیں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں توجہ اور انہماک کے ساتھ سنی جاتی تھیں وہ اقبال اور ان کے معاصرین کے بعد کے شعرا میں بڑی اہمیت رکھتے تھے اقبال سے ان کو بڑی عقیدت تھی انہوں نے یہ تاریخی قطعہ کہا

کون لائے گا اب پیام سروش　　　دل اقبال ہو گیا خاموش

''شمع خاموش'' سال ہجری ہے　　　عیسوی ''شمع شاعری خاموش''

۱۳۵۷ھ　　　۱۹۳۸ء

روزنامہ انقلاب لاہور میں ان کی وفات کی خبر کی اشاعت کے ساتھ ہی مراثی کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا چند یہاں پیش کئے جا رہے ہیں:

### حفیظ ہوشیار پوری ایم۔اے

کوئی اقبال کا ثانی جہاں میں — پس از عمر دراز آئے نہ آئے
حقیقت آشنائے عشق و مستی — پھر اے بزم مجاز آئے نہ آئے
شکستہ تار ہیں ساز خودی کے — وہ صوت دل نواز آئے نہ آئے
ہوا خاموش وہ دانائے راز اب — کوئی دانائے راز آئے نہ آئے
فقیری میں بھی شان پادشاہی — پھر ایسا بے نیاز آئے نہ آئے
گیا وہ چارہ ساز درد ملت — کوئی اب چارہ ساز آئے نہ آئے

### رضا علی وحشت کلکتوی

یہ نہ کہہ اک شاعر ہندوستاں جاتا رہا — پیشوائے نکتہ سنجان جہاں جاتا رہا
باعث ماتم زمانہ کو ہے موت اقبال کی — کارواں رویا کہ میر کارواں جاتا رہا
اب کہاں سے لائیگا کوئی حقیقت میں نظر — آہ اسرار خودی کا راز داں جاتا رہا
آشنا بانگ درا سے ہوگا اب کیا گوش قوم — مجلس اسلامیاں کا نوحہ خواں جاتا رہا
قصہء ماضی میں تحریک عمل باقی نہیں — اب سنیں کیا ہم کہ لطف داستاں جاتا رہا
نالہء غم میں وہ کیفیت نہ پائی جائے گی — آج ذوق شیوهٔ آہ و فغاں جاتا رہا
اب زبان خامہ پر لگ ہی گئی مہر سکوت — وحشت رنگیں بیاں کا قدرداں جاتا رہا

(انقلاب جلد ۱۳ نمبر ۲۴۲ سہ شنبہ ۳ مئی ۱۹۳۸ء)

### منشی محمد دین فوق

برق کی آماج گہہ کو آشیاں سمجھا تھا میں — تھا وہی صیاد جس کو باغباں سمجھا تھا میں
قوم سے جاتا رہا وہ قوم کا اقبال بھی — فطرت حق کا جسے اک راز داں سمجھا تھا میں
یا اسے سمجھا تھا میں پیغمبر دین خودی — یا چراغ محفل ہندوستاں سمجھا تھا میں
دل ہی میں عین الیقیں بن کر چھپا بیٹھا تھا وہ — فوق جس کو برتراز وہم وگماں سمجھا تھا میں

## فیض احمد فیض

آیا ہمارے دیس میں اک بینوا فقیر　　آیا اور اپنی دھن میں غزل خواں گزر گیا
سنسان راہیں خلق سے آباد ہوگئیں　　ویران میکدوں کا نصیبہ سنور گیا
تھیں چند ہی نگاہیں جو اس تک پہنچ سکیں　　پر اس کا گیت سب کے دلوں میں اتر گیا

---

اب دور جا چکا ہے وہ شاہ گدا نما　　اور پھر سے اپنے دیس کی راہیں اداس ہیں
چند اک کو یاد ہے کوئی اس کی ادائے خاص　　دو اک نگاہیں چند عزیزوں کے پاس ہیں
پر اس کا گیت سب کے دلوں میں ہے سر بمہر　　اور اس کی لے سے سینکڑوں لذت شناس ہیں

---

اس گیت کے تمام محاسن ہیں لازوال　　اس کا وفور اس کا خروش اس کا سوز و ساز
یہ گیت مثل شعلہ جوالہ تند و تیز　　اس کی لپک سے بادِ فنا کا جگر گداز
جیسے چراغ وحشت صرصر سے بے خطر　　یا شمع بزم صبح کی آمد سے بے نیاز

(مجلہ راوی مئی جون ۱۹۳۸ء)

## احسان دانش

کہاں ہے آہ اے اقبال اے ملت کے شیدائی　　ترستی ہے ترے دیدار کو چشم تماشائی
ملی تھی سرزمین شور تجھ کو پھول بونے کو　　تری تقدیر تھی بربادیٔ ملت پہ رونے کو
دیا ذوق یقیں کا درس تو نے بے دماغوں کو　　سنبھالا آندھیوں میں روح کے بجھتے چراغوں کو

بدل دی گلستان ہند کی یکسر ہوا تو نے
عطا مستسقیوں کو کر دیا آب بقا تو نے

گداز ایسا بھرا پھر تو نے اپنی داستانوں میں　　کہ زندہ کر دیئے جذبات آزادی جوانوں میں
ترے نغموں سے ہے فولاد کے دل میں لچک پیدا　　تری تانوں سے ہے ہستی کی نبضوں میں دھمک پیدا
بتائے خود فراموشوں کو اسرار خودی تو نے　　بنایا فی الحقیقت آدمی کو آدمی تو نے

تمیز زندگی دی تو نے درس زندگانی سے
چٹانوں کے جگر برما دیئے آتش بیانی سے

مٹایا امتیاز رنگ و نسل آدمی تو نے　　حجاب شاعری میں کی ہے اک پیغمبری تو نے

ہے تیرے زمزموں سے لوچ پیدا کوہساروں میں　　ہے تیرا شعلہ آواز رقصاں برق پاروں میں

تری آتش نوائی سے ہے پتھر میں شرر پیدا　　نگاہوں سے ہے تیری سنگریزوں میں نظر پیدا

دکھائے تو نے ناکاموں کو رستے کامرانی کے
نکالے موت کے دریا سے ساحل زندگانی کے

سنوارا تو نے گیسوئے عروس علم و حکمت کو　　پر پرواز بخشے تو نے ذوق آدمیت کو

تری نظروں میں قیمت ہی نہ تھی کچھ کج کلاہی کی　　حقیقت آشکارا تجھ پہ تھی دین الٰہی کی

کیا ہے پستیوں کو رفعتوں سے آشنا تو نے
سنائی گمرہوں کو پے بہ پے بانگ درا تو نے

مسلمانوں کو پیش اسلام کی توحید کی تو نے　　خدا کے آخری پیغام کی تجدید کی تو نے

ترا ثانی کوئی ہندوستاں میں ہو نہیں سکتا　　یہ سوز بے اماں ساز بیاں میں ہو نہیں سکتا

ترے آتش فشاں پرسوز نغموں سے جہاں جاگا
زمیں نے کروٹوں پر کروٹیں لیں آسماں جاگا

(مئی جون ۱۹۳۸ء بحوالہ اقبالیات مجلّہ راوی)

''شیرازہ'' اس زمانہ کا معروف ادبی مجلّہ تھا جس کے مدیر مولانا چراغ حسن حسرت تھے علامہ اقبال کی وفات کے کوئی ڈیڑھ مہینہ بعد (غالباً جون ۱۹۳۸ء میں) انہوں اس کا ''اقبال نمبر'' شائع کیا جو اس قدر مقبول ہوا کہ اس کو کتابی صورت میں شائع کیا گیا چراغ حسن حسرت ''اقبال نامہ'' میں (یہ اس کتاب کا نام ہے) یوں تحریر کرتے ہیں:

> ''شیرازہ کا یہ نمبر ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ بیرونی ملکوں میں بھی مقبول ہوا اور دیر تک ہندوستان کے مختلف حصوں کے علاوہ ایران، افغانستان، مصر، عراق وغیرہ ممالک سے اس کی فرمائشیں آتی رہیں۔ پچھلے دنوں میاں عبدالحمید بھٹی ایڈیٹر ہونہار نے اصرار کیا کہ اس مجموعہ کو کتابی صورت میں چھاپ دیا جائے چنانچہ ان کے اصرار سے یہ مجموعہ دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے۔ اس مجموعہ میں زیادہ تر وہی مضامین ہیں جو شیرازہ کے

اقبال نمبر میں چھپے تھے لیکن بعض جو شیرازہ کے مختلف پرچوں میں چھپتے رہے ہیں وہ بھی اس میں شامل کردے گئے ہیں"

آگے چل کر وہ اسی دیباچہ میں نظموں سے متعلق یوں لکھتے ہیں:

"علامہ اقبال کی وفات پر جو نظمیں لکھی گئی ہیں ان میں بمشکل ایک آدھ نظم حفیظ ہوشیار پوری کے مرثیہ کے پایہ کی ہوگی۔ یہ مرثیہ پہلی مرتبہ "شیرازہ" کے اقبال نمبر میں شائع ہوا اور اب اسے اس مجموعہ میں شامل کیا جا رہا ہے۔ مولانا حسرت موہانی نے علامہ اقبال کے فرزند جاوید اقبال سلمہٗ کے نام جو تعزیتی خط لکھا تھا اس میں چند اشعار بھی تھے جو غالباً مولانا نے اپنی بیگم صاحبہ کی وفات پر لکھے تھے۔ چونکہ مولانا کے خط سے معلوم ہوتا تھا کہ علامہ اقبال کی وفات کا واقعہ بھی کسی حد تک یہ اشعار لکھنے کا محرک ہوا ہے اس لئے میں نے شیرازہ میں یہ خط بجنسہٖ شائع کردیا۔"

اس مجموعہ "اقبال نامہ" میں شامل نظمیں (مراثی) مولانا حسرت موہانی کے خط کے ساتھ پیش کی جا رہی ہیں۔

## اشکِ خونیں

ازمولانا حسرت موہانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کانپور مورخہ ۲۲ اپریل ۱۹۳۸ء

عزیزی

السلام علیکم! صبح کے اخباروں میں اقبال مرحوم کے انتقال پُر ملال کا حال پڑھ کر جس قدر صدمہ ہوا اس کا اظہار بذریعہ الفاظ نہیں ہوسکتا۔

اللہ تعالیٰ ان کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ اپریل ۱۹۳۷ء میں بیگم حسرت کا انتقال ہوا تھا۔ اس سانحہ ہوش ربا کے بعد فقیر کا دل مشغلہ شعر و سخن سے سرد ہو چکا تھا کہ اقبال کے حادثہ عظیم نے بے دلی و افسردہ مزاجی کی تکمیل کردی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

عاشقی کا حوصلہ بے کار ہے تیرے بغیر
آرزو کی زندگی دشوار ہے تیرے بغیر

کاروبار شوق کی اب وہ تن آسانی کہاں؛
دل پہ شوق شاعری اک بار ہے تیرے بغیر

شرکت بزم سخن سے بھی ہمیں باوصف عزم — برہنائے بے دلی انکار ہے تیرے بغیر
جس فراغت کا تمنائی تھا میں تیرے لئے — اب وہ حاصل ہے تو اک آزار ہے تیرے بغیر

درد دل جو تھا کبھی وجہ مباہات وشرف
بہر حسرت موجب صد عار ہے تیرے بغیر

غمزدہ حسرت موہانی

## حفیظ ہوشیار پوری ایم۔اے

ہوا ہے قوم کے اقبال کا لبریز پیمانہ — گیا وہ ساقی بزم خودی ویراں ہے میخانہ
جو قندیل نوا راہ مستقبل دکھاتا تھا — جو رو رو کر سناتا تھا غم ماضی کا افسانہ
غلاموں کو کیا ذوق یقیں سے آشنا جس نے — گداؤں کو بتائی جس نے رسم و راہ شاہانہ
"یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم" — زمانہ کو دیا جس نے یہ پیغام حکیمانہ
رلائیگا ہمیں اقبال کا عزم سفر برسوں — نہ ہوگی اس شب تاریک ہجراں کی سحر برسوں

---

کچھ اس انداز سے چھیڑی حدیث آرزو مندی — غبار راہ کو تو نے عطا کی شان الوندی
جو پایا تجھ کو اپنا "محرم اسرار" فطرت نے — تجھے سونپی عروس علم و حکمت کی حنابندی
جہان آب و گل سے لے اڑا ذوق خودی تجھ کو — گوارا ہو نہ سکتی تھی تجھے جینے کی پابندی
ہم آغوش اس شرار جاوداں سے ہو گیا آخر — تری آتش کو بھڑکاتی تھی جس کی "دیر پیوندی"
نشاط جاوداں تیرا بہشت جاوداں تری — فروغ لامکاں تیرا فضائے لامکاں تیری

---

نظر سے جلوۂ آخر کی تابانی نہیں جاتی — دل مہجور کی آئینہ سامانی نہیں جاتی
ہوا تیرے "شکوہ مرگ" سے ثابت کہ مر کر بھی — پرستاران حق کی خندہ پیشانی نہیں جاتی
تری تربت پہ جاتے ہیں بلاتے ہیں جگاتے ہیں — یہ نادانی سہی لیکن یہ نادانی نہیں جاتی
تو وہ شہکار فطرت تھا کہ تجھ کو چھین کر ہم سے — نہیں جاتی مشیت کی پشیمانی نہیں جاتی
جہاں آباد ہے تجھ سا مگر انساں نہیں کوئی — ستارے ہیں بہت لیکن مہ تاباں نہیں کوئی

---

تجھے ہم عمر بھر روئیں مگر رونے سے کیا حاصل — نہ تجھ کو پا سکیں گے اپنی جاں کھونے سے کیا حاصل

ترا داغ جدائی حشر تک دل سے نہ جائے گا
یہ ڈھل سکتا نہیں اشکوں سے منہ دھونے سے کیا حاصل

نہ پھوٹے گا نہال آرزو آنسو بہانے سے
یہ دانے اب زمین شعر میں بونے سے کیا حاصل

یہ نالے جب بدل سکتے نہیں تقدیر انساں کو
تو ان مجبوریوں پر نوحہ خواں ہونے سے کیا حاصل

نہ پایان طلب کوئی نہ انجام تمنا ہے
اثر فریاد لب ہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

---

یہ ممکن ہے رگ گلبرگ تر سے ہو شرر پیدا
نہیں ممکن کوئی اقبال سا ہو پھر بشر پیدا

حیات آوارۂ دیر وحرم رہتی ہے صدیوں تک
تو بزم عشق سے ہوتا ہے اک صاحب نظر پیدا

کئی پرویز دادِ عیش وعشرت دے کے مرتے ہیں
تو ہوتا ہے کہیں فرہاد سا خونیں جگر پیدا

''ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدور پیدا''

نہ جانے کتنی مدت آفتاب اس غم میں جلتا ہے
تو سنگ تیرہ لعل بے بہا بن کر نکلتا ہے

---

دیار شوق سے یا رب کوئی معنی طراز آئے
بہ آہنگ حجازی پھر صدائے دل نواز آئے

فلک نے مشعل خورشید لے کر جس کو ڈھونڈا تھا
کہیں سے وہ امین دولت سوز و گداز آئے

فقیر رہ نشیں کو خو غرور خسروی بخشے
خمستان خودی سے وہ شراب خانہ ساز آئے

سرود رفتہ کی پھر آرزو ہے گوش معنی کو
کسی وادی سے پھر اقبال سا دانائے راز آئے

ترا قسمت شناس اے گلشن ایجاد پیدا ہو
کوئی نوحہ گر غرناطہ و بغداد پیدا ہو

---

## سراج الدین ظفر

دیار ہند میں آوارہ تھی جو بوئے لطیف
اڑا کے لے گئی اس کو ہوائے ذوق وصال

لب نیاز پہ لرزاں تھی جو نوائے سروش
پہنچ گئی وہ تڑپ کر سر حریم جمال

کہاں ہے آج وہ آئینہ دار حسن خودی
جلائی برق حقیقت سے جس نے شمع خیال

کہاں ہے آج وہ نغمہ طراز ساز الست
دلوں میں پھونک دی جس کی نوا نے روح بلالؓ

دراز دستی فطرت سے ہو گیا خاموش
وہ ساز عشق کہ جس کی نوا تھی بادشمال!

خزاں کی تند ہواؤں کی تاب لا نہ سکی
وہ شمع تھامہ و پرویں کی طرح جس کا جلال

تجھے خبر بھی ہے اے دست بے پناہ اجل — تری جفا سے ہوئی کشت عاشقی پامال
تجھے خبر بھی ہے اے رستخیز باد فنا — کہ بجھ گئی تری جولانیوں سے شمع کمال
ہوا خموش مدینہ کا ساز روح گداز — نوائے طوطی بام حرم ہے بے پر وبال
کہاں وہ سوز نواہائے زندگی افروز — کہاں وہ لطف تب و تاب محفل اقبال

نظر میں اب بھی ہیں نقشے وہی سمائے ہوئے
عروس شعر ہے ماتم میں سر جھکائے ہوئے

--------------

آخر میں چند قطعات و مادہ ہائے تاریخ جو وفات کے فوری بعد کہے گئے پیش کئے جاتے ہیں۔

## حفیظ ہوشیار پوری

(۱)

رخت بربست از جہاں اقبال ما — آں امین سوز مشتاقی نماند
ماتہی پیمانہ وا ماندیم حیف — آں قدح بشکست وآں ساقی نماند
در "مسافر" گفت خود سال وفات — "صدق و اخلاص ووفا باقی نماند"

۱۳۵۷ھ

(۲)

اقبال نے جاری کیا دنیا میں آئین خودی
سال وفات اس کا ہے یہ پیغمبر دین خودی

۱۹۳۸ء

(۳)

رخ مشرق پہ کیوں چھائی ہے ظلمت — یہ کس کی زندگی کی شمع گل ہے
گہن میں آگیا مہر جہاں تاب — شبستان خودی کی شمع گل ہے

۱۹۳۸ء

نوید ظفر

# چترال

گزشتہ مضمون میں ہم نے پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں کوہ ہندوکش کے پہاڑی سلسلے کا ذکر کرتے ہوئے ترچ میر کی چوٹی کا ذکر کیا تھا' ۲۵۲۳۰ فٹ بلند اس چوٹی کے دامن میں چترال کا خوبصورت شہر آباد ہے' چاروں طرف سے اونچے قد آور پہاڑوں کے درمیان چترال کی خوبصورت وادی' اپنے ہم نام دریائے چترال کے اردگرد پھیلی ہوئی ہے۔ شہر دریا کے دونوں طرف آباد ہے' تقریباً ۵۰۰۰ فٹ کی بلندی پر دریائے چترال شہر کے شمال میں ۱۵۰ میل کے فاصلے پر درۂ قرنبر سے نکلتا ہے اور نہایت خاموشی اور سادگی سے گزرتے ہوئے رندو سے ہوتا ہوا ۲۰۰ میل کا فاصلہ طے کر کے افغانستان کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے دریا کے کنارے مٹی ریت اور پتھر کافی دور تک پھیلے ہوئے ہیں' چنانچہ سردیوں کی دھوپ میں ٹیلی وژن کی نشریات آجانے کے بعد اب بچے یہاں بھی کرکٹ کھیلتے نظر آتے ہیں' دریا کے کنارے تو بچوں نے کھیلوں سے آباد کر لئے ریت میں اب بھی لوگ سونے کے ذرات تلاش کرتے ہیں دریا کے پانی پر شہر کے لوگوں نے جابجا بند باندھ کر چھوٹے چھوٹے تالاب بنا لئے ہیں' ان تالابوں کے کنارے نوجوان فجر کی نماز کے بعد مچان تان کر بیٹھ جاتے ہیں اور موسم سرما کی یخ آلود ہواؤں سے بے پروا شمالی ممالک سے آنے والی مرغابیوں کے منتظر رہتے ہیں' بندوق مرد کا زیور سمجھی جاتی ہے اور سوائے مرغابی کے شکار کے چترال کے خاموش اور سنجیدہ شہری بندوق کا استعمال شاذو نادر ہی کرتے ہیں' مرغابی کے شکار میں بھی اہل چترال کے ضوابط نہایت واضح ہیں کسی دوسرے شکاری کے تالاب پر بیٹھی مرغابی کا شکار کرنا ناجائز خیال کرتے ہیں' یہاں تک کہ اگر مرغابی ان کے تالاب کی حدود سے باہر نکل جائے تو اس کی جانب سے بندوق کا رخ موڑ لیتے ہیں۔

جہاں مرغابی کے شکار کے لئے ایسے واضح قوانین اپنائے گئے ہوں وہاں چترال میں ایک اور کھیل زمانہ قدیم سے بغیر کسی مستند بنیادی قوانین کے جاری ہے' اس کھیل کا نام چوگان یا پولو ہے' ہر گاؤں میں پولو کے گراؤنڈ موجود ہیں' یہ گراؤنڈ دنیا میں استعمال ہونے والے پولو کے میدانوں کی مجوزہ پیمائشوں سے بالکل

مختلف ہیں' حقیقت میں یہ میدان آپس میں بھی کسی باضابطہ پیائش پر پورے نہیں اترتے' چوڑائی میں کم اور لمبائی میں جس قدر جگہ پہاڑی نشیب وفراز سے بچ کر ہموار صورت میں میسر آجائے کھیل کا میدان تیار ہو جاتا ہے کھلاڑیوں کے لیے بھی کوئی باقاعدہ تعداد کا تعین ضروری نہیں عام طور پر طاق اعداد میں ۷' ۹ یا ۱۱ کھلاڑیوں کے ساتھ ایک ٹیم تشکیل پاتی ہے' ایک زمانہ میں گیند کی جگہ بکری' زندہ یا ذبیحہ شکل میں استعمال ہوتی تھی' اسے بزکشی کہا جاتا تھا اب بھی بزکشی کے مناظر گلگت اور چترال میں گرمیوں کے موسم میں نظر آجاتے ہیں' چترال کے لوگوں کا خیال ہے کہ چوگان' پولو کا آغاز چترال کی وادیوں سے ہوا' اور پھر یہ دنیا کے مختلف ممالک نے اپنے اپنے انداز سے اپنا کر اس میں اپنے مزاج کے مطابق قوانین مرتب کیئے۔

چترال کے عوام کے نزدیک پولو کا کھیل ایک تہوار کا مقام رکھتا ہے' ریاستی سطح پر چترال کے لوگ اہل گلگت کو ہی اپنا حریف سمجھتے ہیں' چنانچہ گلگت اور چترال کے درمیان ہر سال باقاعدہ مقابلے ہوتے ہیں' جن میں دونوں شہروں سے لوگوں کی کثیر تعداد شائقین کے طور پر شریک ہوتی ہے کھیل سے ایک روز پہلے موسیقی کی خصوصی محفل منعقد ہوتی ہے ہر شخص موسیقی اور رقص میں شریک ہوتا ہے۔رقصوں میں پھستوک اور نوھتک کسی آلہ موسیقی کے بغیر مخصوص گانوں کی لے پر چھ سے دس افراد ایک قطار میں ہاتھ پکڑ کر ناچتے ہیں' موسیقی کی یہ محفل رات گئے تک جاری رہتی ہے' اس دوران قہوے کا مشروب عام طور پر استعمال میں رہتا ہے۔

پولو کھیل کے دوران ڈھول کی مخصوص دھنیں ترتیب پاتی ہیں' ہر کھلاڑی سے ایک دھن مخصوص کر دی جاتی ہے اور جب گیند کسی کھلاڑی کے پاس پہنچتی ہے تو اس سے مخصوص دھن بلند کر دی جاتی ہے' اسی طرح گول ہونے پر خصوصی دھنیں بجائی جاتی ہیں' تاکہ جو تماشائی میدان میں موجود نہ ہوں' وہ ڈھول کی آواز سے اندازہ کر لیں کہ کھیل میں کون سا کھلاڑی نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کر رہا ہے اور کون سی ٹیم فتح یاب ہے۔

گزشتہ چند برسوں سے شیندور میں جولائی کے مہینے میں گلگت اور چترال کے درمیان پولو کے مقابلے سرکاری سرپرستی میں منعقد ہو رہے ہیں شیندور گلگت اور چترال کے درمیان ۱۲۰۰۰ فٹ سے بلند نہایت خوبصورت وادی ہے' جہاں سال میں چھ سات ماہ برف گرتی رہتی ہے۔اس بلند و بالا وادی میں پولو کا میدان دنیا کا بلند ترین مقام تسلیم کیا گیا ہے بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر گھوڑوں کو پولو کے لئے تیار کرنا بجائے خود ایک مشکل کام ہے ہر سال کھیلوں کے دوران کئی گھوڑے سانس کی تکلیف میں مبتلا ہو کر اس کھیل پر قربان ہو جاتے ہیں۔مگر کھیل جاری رہتا ہے۔

چترال کے مقامی شہری اپنے علاقہ کو چھترار پکارتے ہیں، سردیوں میں پہاڑوں پر برف گرنے سے، یہ علاقہ تقریباً پانچ ماہ تک بیرونی دنیا سے کٹ جاتا ہے۔ ۱۹۶۴ء سے یہاں پشاور اور چترال کے درمیان ہوائی سفر کا آغاز کیا گیا۔ سردیوں میں فوکر جہاز کی آواز اہل چترال کے لئے سب سے حسین آواز ہے۔ جس کے سبب چترال کا رابطہ باقی ملک سے بحال رہتا ہے۔ درہ لواری کے جو دس ہزار فٹ سے زیادہ بلند ہے بیچوں بیچ ۸ میل لمبی سرنگ کا منصوبہ بھی چترال کے لئے تشکیل دیا گیا ہے ۱۹۴۷ء میں چترال پہلی ریاست تھی جس نے مملکت پاکستان کے ساتھ اپنے الحاق کا اعلان کیا۔ ۱۹۶۹ء میں چترال کو ضلع کا درجہ دے کر پاکستان کے ساتھ مدغم کر دیا گیا تازہ ترین مردم شماری کے مطابق مقامی آبادی کم وبیش چار لاکھ افراد پر مشتمل ہے جن کی زبان کھوار ہے، چترال کے لوگوں کو اپنی زبان سے بہت پیار ہے اور شعروادب کے حوالے سے اس زبان کا دامن نہایت وسیع ہے، تاہم اردو عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

چترال کی تاریخ نہایت قدیم ہے، یہاں پختوری، برے نس اور بونی میں پتھروں پر کندہ تحریریں ملی ہیں جو برہمی یا خروشی حروف میں قدیم ترین حوالہ جات کا نمونہ ہیں۔ ان میں سے ایک چٹان پر یہ تحریر کندہ ہے ''جے ورمن کی طرف سے خداؤں کے نام ہدیہ تبریک'' مقامی آبادی کا خیال ہے کہ جے ورمن زمانہ قدیم میں کوئی بادشاہ ہوگا، جس کا مذہب بدھ مت ہوگا۔ اسی طرح رائیں گاؤں میں ایک بڑے پتھر پر قدیم تحریریں کندہ ہیں، جن کے ساتھ ایک سٹوپا کی شکل بھی کندہ ہے۔

چترال کے مہتر کا قلعہ دریائے چترال کے کنارے اہم تاریخی مقام ہے، چترال کے شاہی خاندان کے افراد نے اس قلعہ کو حتی المقدور محفوظ رکھا ہے، قلعہ میں شاہی دربار کا تخت اور کرسیاں اپنی اصل حالت میں موجود ہیں۔

مقامی لوک کہانیوں میں رحمت ملنگ کی کہانی جو انیسویں صدی کے آخر میں مشہور ہوئی، آج بھی زبان زد عام ہے۔ اس کہانی کے مطابق رحمت ملنگ کے پاس بونیال کے گاؤں بوبر میں ایک خوبصورت خاتون یورمس تعویز لکھوانے آئی تو ملنگ کا دل اس کے اختیار میں نہ رہا۔ تعویذ کے بجائے اس نے ایک شینا دار زبان میں یہ شعر تحریر کیا

قلم بایں کاغذ سانتھ      خیال یوجیس بورمے سانتھ

یعنی کہنے کو تو قلم کاغذ پر لکھ رہا ہے لیکن میرے خیال کا مرکز یورمس ہے یورمس شادی شدہ عورت تھی،

ملنگ نے یورمس کی ازدواجی زندگی میں تو دخل اندازی نہ کی لیکن اپنی باقی ماندہ عمر یورمس پر اشعار تحریر کرتے گزاردی۔ ان کے دو اشعار مزید درج کئے جاتے ہیں۔

سامون تھے ایک رونگ سانتھ روبرو بین پھرتے سانتھ

میئی جیل نش بدن سانتھ خیال یوجنیں ہمیش یورمس سانتھ

یعنی جب تو ایک رنگ کا لباس پہن کر پھولوں کے سامنے آنکلتی ہے تو میری جان بدن میں نہیں رہتی۔ جو خیال میں ہمیشہ یورمس کے ساتھ رہتی ہے موجودہ حد بندی کے مطابق بونیال اور بوہر چترال سے نکال کر شمالی علاقہ جات میں شامل کر لئے گئے ہیں۔ چترال کی مقامی صنعت میں اون کی پٹی خصوصی حیثیت رکھتی ہے' سفید یا خاکی مائل گھریلو صنعت کا گرم کپڑا چترال سے باہر بھی بڑی قدر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ مقامی لوگ اس سے کوٹ یا ٹوپی بنواتے ہیں۔ چترال کے لوگوں کو چونکہ زیادہ تر سرد موسم کا سامنا رہتا ہے' اس لئے اپنی نشست کے لئے ایک خصوصی کمرہ جسے پائی پش کہتے ہیں' عام طور پر بناتے ہیں روائتی طور پر کمرے کے درمیان میں چولہا اور ارد گرد بیٹھنے کے لئے دری یا گدے بچھائے جاتے ہیں۔ چولہے پر کھانا یا چائے بنتی رہتی ہے اس طرح کمرہ گرم بھی رہتا ہے۔

## وادی کیلاش (کافرستان)

کوہ ہندوکش کے سلسلے میں چترال کی خوبصورت وادی کے ساتھ سب سے زیادہ پرکشش اور پر اسرار خطہ کیلاش یا کافرستان کا ہے۔ چترال سے تقریباً پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر اورایون کے خوبصورت گاؤں سے ۱۵ کلومیٹر کے فاصلے پر تین وادیوں پر پھیلا ہوا کیلاش کا خوبصورت علاقہ ہے یہ وادی بمبریت' ریمبور اور بریر ہیں' ان پہاڑی سلسلوں میں بمبریت سب سے بڑی اور بریر سب سے چھوٹی ہے۔ چترال آنے والوں کی سب سے بڑی خواہش کیلاش کی ان تین والدیوں تک پہنچ کر یہاں کے مقامی رسم ورواج سے آگاہ ہونا اور یہاں کی آبادی بالخصوص خواتین کو ان کے مخصوص سیاہ لباس کے ساتھ جن میں سیپیوں کی ٹوپی اور گلے میں موتیوں کی مالائیں بہت نمایاں ہیں تصاویر کا مرکز بنانا ہوتا ہے' پاکستان میں شاید ہی کسی خطے کے لوگوں کو اس قدر کیمرے اور دستاویزی فلموں کا موضوع بنایا گیا ہو جیسا یہاں کے عوام کو بنایا گیا ہے۔

ان تین وادیوں کے رہنے والوں کو مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ اول کافرستان چونکہ چترال کی اکثریت اس علاقے کے باسیوں کو ان کے قدیم رسم ورواج کی وجہ سے کافر خیال کرتی ہے اس لئے اس

علاقہ کا قدیم نام کافرستان مشہور رہا ہے دوئم دشوار گزار وادیوں میں رہنے کے سبب یہ لوگ مقامی طور پر اپنے علاقہ میں محدود ہو کر رہ گئے تھے اس اعتبار سے یہاں کے لوگ تعلیم اور تجارت میں بالکل پس ماندہ اور غربت کا شکار رہے، اردگرد کے شہر کے لوگ ان کی زبوں حالی کو 'فلاش' یا بالکل غریب کے لفظ سے تعبیر کرنے لگے فلاش کا لفظ ان کے علاقے کی پس ماندگی کے حوالے سے ایسا چسپاں ہوا کہ اس خطے کو کیلاش بھی کہا جاتا ہے۔

ایک روایت کے مطابق ۳۶۷ ق م میں جب سکندر اعظم نے اس خطہ پر حملہ کیا تو اس کی فوج کے بعض یونانی سپاہی یہاں رہ گئے۔ زبان اور رسم ورواج میں یہاں کے عوام کی بعض قدریں یونانیوں کی قدیم تاریخ سے مشترک معلوم ہوتی ہیں، اسی طرح بعض دیگر مورخین نے کیلاش کے عوام کو افغانستان و ایران اور عرب نسل سے بھی تعبیر کیا ہے، جو مختلف حملہ آوروں کے خوف سے ان وادیوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔

کیلاش کے مقامی لوک گیتوں کا مطالعہ کرنے کے بعد مقامی محقق محمد پرویش شاہین نے کیلاش کے مقامی باشندوں کو چترال کے قدیم اور اصل باشندے قرار دیا ہے ان کے لوک گیتوں کے مطابق دروش، مستوج اور گلگت تک ان قدیم لوگوں کا سلسلہ چلتا تھا، اور وہاں کے حکمرانوں شاہ لاک اڈابوک پوپول، گلہ سنگ، شربیک، راجہ وائی، راجہ سوملیک، راجہ زوندرون، اور راجہ ہرایو کے نام بھی ان کے حوالوں میں ملتے ہیں، اسلام کی آمد سے قبل ان راجاؤں کی حکومت ہزارہ، چترال، باجوڑ، دیر، سوات اور افغانستان کے بعض علاقوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ اکبر ایس احمد کی تحقیق کے مطابق یہ لوگ افغانستان کے علاقے کافرستان کے مقامی باشندے تھے، کافرستان میں اسلام کی آمد پر یہ وہاں سے فرار ہو کر اپنی تہذیب اور ثقافت اپنے سینے سے لگائے بمبریت رمبور اور بریر کی وادیوں میں چھپ گئے۔ افغانستان میں پنج شیر کے مشرق میں کافرستان کا علاقہ، اسلام کی روشنی سے منور ہونے کے بعد نورستان کے نام سے مشہور ہے، کافرستان کے ان باسیوں نے اپنی روایات کے پیش نظر اپنے نئے مسکن کا نام بھی اپنا قدیم نام کافرستان ہی رکھا۔

کئی سو برس تک کیلاش کے باشندے چترال کی مقامی مسلمان آبادی سے کٹ کر اپنی وادیوں میں غربت اور افلاس کے ساتھ اطمینان کی زندگی گزارتے رہے قیام پاکستان کے بعد جب علاقے میں خوشحالی اور وسائل نقل وحرکت نے ترقی اختیار کی اور ملک کے رہنے والوں کو فارغ وقت اور سرمایہ نے اجازت دی تو وادی کیلاش کا دروازہ بیرون شہر کے سیاحوں پر کھل گیا۔ ٹیلی وژن کے آنے کے بعد یہ علاقہ کیمرہ اور

دستاویزی پروگراموں کا ایسا وسیع موضوع بنا کہ ملک کے دور دراز کے رہنے والے لوگوں نے ان وادیوں کا تعارف حاصل کرنے کے بعد یہاں کا رخ کیا اور یہاں کے عوام کو دلچسپی سے دیکھا مستنصر حسین تارڑ ' جمال حیدر صدیقی' حنیف رضا اور کئی دیگر مصنفین نے ان کے حوالے سے کتابیں اور تصویری مجموعے شائع کر کے لوگوں کو یہاں آنے کا راستہ دکھایا یہاں کے رہنے والے لوگ محنتی ہیں ان کے رنگ صاف بال سیاہ' بھورے اور **Blonde** یعنی سفیدی مائل بھی ہیں' اس طرح ان کی آنکھیں سبزی مائل' نیلی' براؤن اور سیاہ مختلف رنگوں میں منقسم ہیں بالوں اور آنکھوں کے ان متنوع رنگوں کے سبب محققین یہاں کے باسیوں کا تعلق یونان کے قدیم سپاہیوں سے جوڑتے ہیں۔

قدرتی خوبصورتی سے مالا مال اس خطے میں ٹھنڈے پانی کے چشمے سبز اور خوبصورت پہاڑ' جو سال کا زیادہ عرصہ برف سے سفید رہتے ہیں کھیتی باڑی کا کام زیادہ تر عورتیں کرتی ہیں اور جانوروں میں بیل کے ساتھ گائے بھی ہل میں استعمال ہوتی ہے موسم گرما میں یہاں مکئی کے کھیت لہلاتے ہیں' اخروٹ' ناشپاتی' خوبانی' شہتوت' سیب اور انگور کے پھل پائے جاتے ہیں بہتے ہوئے ٹھنڈے پانی کے چشموں میں ٹراوٹ مچھلی بھی ملتی ہے مئی کے مہینے میں علاقہ پر بہار آتی ہے' تو علاقہ مختلف رنگوں کے پھولوں سے مہک اٹھتا ہے کیلاش کے لوگ موسم بہار کا استقبال پور رے زور وشور سے کرتے ہیں اور زندگی کے رنگ اپنی ذات میں سمیٹنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔

مقامی تہواروں میں سب سے اہم تہوار چلم جوشٹ ہے جو مئی کے وسط میں موسم بہار کی آمد کے موقع پر منایا جاتا ہے گھروں' مویشیوں اور عبادت گاہوں کو اس موقع پر پھولوں اور درختوں کی سرسبز شاخوں سے سجایا جاتا ہے مہمانوں کی تواضع دودھ سے کی جاتی ہے پرانے دنوں میں یہ تہوار اٹھارہ دن تک منایا جاتا تھا۔اس تہوار کے دوران موسیقی اور رقص کی محفلیں آراستہ کی جاتی تھیں۔ یہ محفلیں مقامی آبادی کے لئے مذہبی تہوار کا درجہ رکھتی ہیں اور مذہبی پیشوا بھی ان محفلوں میں شریک ہوئے ہیں تاہم وقت کے ساتھ یہ تہوار محدود ہو کر تین دن تک رہ گیا ہے کیلاش کا دوسرا بڑا تہوار اوچھال جون کے آخر میں شروع ہو کر جولائی کے وسط تک جاری رہتا ہے یہ تہوار فصلوں کے پکنے اور ان کی کٹائی سے منسلک ہے' ان چالیس دنوں کے دوران کیلاش کے باشندے ناچنے اور گانے کی محفلیں سجاتے ہیں' تقریب کا آخری دن اوچھال کہلاتا ہے' مہمانوں کی تواضع روٹی اور پنیر سے کرتے ہیں۔

ستمبر کے آخر میں اخروٹ اور انگور کی فصل تیار ہونے کی خوشی میں مقامی باشندے پوڑ نام کا تہوار منعقد کرتے ہیں' اس تہوار سے اخروٹ اور انگور اتارنے کا آغاز ہوتا ہے' یہ تہوار اب کیلاش کی تینوں وادیوں میں صرف بریر کے علاقے میں محدود ہو کر رہ گیا ہے اس موقع پر بودلک نوجوانوں کا استقبال بھی کیا جاتا ہے یہ نوجوان گرمیوں کے موسم میں جانوروں کی دیکھ بھال کے لئے پہاڑوں پر بھیجے جاتے ہیں اور تمام گرمیاں مویشیوں کے ساتھ گزارنے کے بعد موسم سرما کے آغاز سے پہلے وادی میں واپس پلٹتے ہیں' ان چرواہوں کا استقبال بڑے والہانہ انداز سے کیا جاتا ہے' اور جانوروں کے ساتھ گزارا جانے والا وقت ان کی قربانی کے حوالے سے بڑا قیمتی تصور کیا جاتا ہے۔ تاہم کیلاش کی وادیوں میں صنعت و حرفت اور دیگر معیشی وسائل مہیا ہو جانے کے بعد بودلک کی روایت محدود ہوتی جا رہی ہے۔

مقامی آبادی کا آخری اہم تہوار چیٹرس ۲۱ دسمبر کو نئے سال کی آمد کا اعلان کرتا ہے چیٹرس کو کیلاش کی مقامی آبادی کا کرسمس سمجھنا چاہئے یہ انہی دنوں میں منعقد ہوتا ہے تقریباً ایک ہفتہ جاری رہتا ہے خوشی کا تہوار کہلاتا ہے اس موقع پر بڑے میدان میں رقص کا مقابلہ ہوتا ہے' اس مقصد کے لئے رات کے وقت آگ کے الاؤ روشن کئے جاتے ہیں' رقص کے اس مقابلے کو سرازمی کہتے ہیں گانے اور شاعری کے مقابلے بھی ہوتے ہیں تہوار کے ایک دن آٹا گوندھ کر مختلف جانوروں کی شکلیں بنائی جاتی ہیں' مارخور کی بڑی شبیہیں کثرت سے بنائی جاتی ہیں' لوگ انہیں اپنے گھروں کی چھتوں پر رکھ دیتے ہیں گزرنے والے انہیں پتھر مارتے ہیں اور گھر کے رہنے والے پتھر مارنے کے جواب میں ایک چھڑی کے ساتھ فرضی مارخور گھر سے نکالتے ہیں گویا وہ گھر سے برے اثرات ختم کر رہے ہیں' اس رسم کو شارابیڑا ٹیک کہتے ہیں اس رسم کو امریکی تہوار Halloween کی قدیم شکل بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس تہوار کے دوران جانوروں کی قربانی دی جاتی ہے خصوصی بات یہ ملحوظ رکھی جاتی ہے کہ مرد نر جانوروں کا گوشت اور عورتیں مادہ جانوروں کا گوشت ہی کھاتی ہیں' گویا ہر گھر میں گوشت دو مخصوص طریقوں سے پکتا ہے اور مرد اور عورتیں مل کر کھانا نہیں کھاتے۔ کیلاش کے لوگوں کی شادی کی رسم بھی بڑی دلچسپ ہے۔ پرانے زمانے میں ضروری سمجھا جاتا تھا کہ دولہا' دولہن کے خاندان کا سات نسل تک ایک دوسرے سے شادی کا رشتہ نہ رہا ہو۔ تاہم یہ روایت اب ختم ہوتی جا رہی ہے۔ شادی کی اولین قسم تو الی ہے جس میں لڑکا اور لڑکی باہمی رضامندی سے شادی کر لیں جو زیادہ تر رائج ہے دوسری صورت میں بھی والدین دولہا دولہن سے رضامندی حاصل کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

شادی کی تقریب مقامی عبادت گاہ جسے جستک ہان کہتے ہیں وہاں منعقد ہوتی ہے۔ اس موقع پر بکرے کی قربانی کر کے' اس کا خون نو بیاتا جوڑے پر چھڑکا جاتا ہے' یہ ان کے باضابطہ دولہا دولہن بننے کا اعلان ہے بیویوں کی تعداد ایک سے زیادہ ہوسکتی ہے اور بیویوں کی تعداد کے حوالے سے مرد کو معاشی حیثیت میں معتبر خیال کیا جاتا ہے۔

بچے کی پیدائش گھر کے بجائے' ایک مخصوص گھر میں عمل میں آتی ہے جو اس مقصد کے لئے آبادی سے الگ تھلگ تعمیر کیا جاتا ہے اس عمارت کو بشالینی کہتے ہیں' اس موقع پر دیوتا کے حضور اخروٹ پیش کئے جاتے ہیں بچے کی پیدائش کے دو ہفتے تک ماں اور بچہ بشالینی ہی میں قیام کرتے ہیں۔ اس دوران کوئی مرد حتیٰ کہ نوزائیدہ بچے کا باپ بھی عمارت کے اندر جا کر اپنے بچے کو نہیں دیکھ سکتا۔

ماں بچے کی واپسی کے بعد گھر میں خصوصی تقریب منعقد ہوتی ہے جو لڑکے کی پیدائش کی صورت میں اکیس دن اور لڑکی کی پیدائش کی صورت میں بیس دن تک جاری رہتی ہے' اس دوران مختلف لوگ مبارکباد دینے گھر آتے ہیں۔ مقررہ مدت مکمل ہونے کے بعد آگ جلا کر اس میں گھر کے پرانے بزرگوں کے نام سے منسوب کر کے گندم کے دانے ایک ایک کر کے آگ میں پھینکے جاتے ہیں جو دانہ آگ کی تپش کے سبب واپس باہر آگرے' اُس بزرگ کے نام پر بچے کا نام رکھ دیا جاتا ہے۔ بچے کی عمر ایک سال ہو جانے پر بچے کی سالگرہ منائی جاتی ہے اور اس کے سر پر تین چار انچ بال چھوڑ کر باقی سر صاف کر دیا جاتا ہے اس موقع پر بھی خوشی منائی جاتی ہے' اسی طرح دو سال مکمل ہونے پر بکری کے بچے کو ذبح کیا جاتا ہے۔ اور ذبح شدہ بکری کا خون بچے پر چھڑک دیا جاتا ہے۔ اس رسم کا مقصد اس بات کا اعلان ہے کہ بچہ کیلاش برادری کا مستند شہری ہے۔

جب لڑکا بارہ برس کا ہو جاتا ہے تو اسے بالغ مرد قرار دیا جاتا ہے اور اس کے لئے مکمل لباس کی شرط طے پاتی ہے' جس کے مطابق اسے اپنا جسم ہاتھ منہ اور پیر کے علاوہ مکمل طور پر ڈھانپنا چاہیے۔ کیلاش مرد عام طور پر شلوار قمیص پہنتے ہیں اسی طرح لڑکیوں کے بال چھ سال کی عمر پر کھول دیئے جاتے ہیں بیس اور بارہ برس کی عمر کے بعد ان کے بلوغت کے اعلان کے طور پر چوٹیوں کی شکل میں باندھ دیے جاتے ہیں۔

بیماری کی صورت میں لوگ کثیر تعداد میں عیادت کو آتے ہیں' مقامی عقیدہ ہے کہ جتنے زیادہ لوگ مریض کی عیادت کے لئے آئیں گے بیماری اتنی ہی جلدی مریض سے دور رہو جائے گی۔

مریض کے سامنے رقص کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے تاکہ دیوتا' رقص سے خوش ہو کر مریض کو مرض سے

نجات دے۔

موت کی صورت میں میت کو تابوت میں رکھا جاتا ہے مردہ شخص کے کارناموں کا ذکر کیا جاتا ہے' رقص اور مخصوص ساز بجانے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ قبرستان میں تابوت رکھ دیا جاتا ہے اور اسے دفن نہیں کیا جاتا تابوت کے اوپر رکھا جانے والا ڈھکن بھی میخوں سے بند نہیں کیا جاتا' بلکہ کھلا رہتا ہے۔ میت کے دائیں ہاتھ میں گھی یا مکھن' اور چینی رکھ دی جاتی ہے اور بائیں ہاتھ کے نیچے روٹی رکھی جاتی ہے۔ مرنے والے یا مرنے والی کی وفات کے ایک برس بعد اس کی یاد میں لکڑی کا ایک بت یا پتلا بنا کر اس کی قبر کے سرہانے کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ مرنے والے کی یاد میں پودے بھی لگائے جاتے ہیں' جنہیں مرنے والے سے منسوب سمجھا جاتا ہے۔

کیلاش لوگ اپنے رسم ورواج کا بڑی سختی سے تحفظ کرتے ہیں اگر کوئی مردے کو کیلاش رسوم کے مطابق دفن نہ کرے یا کوئی مرد یا عورت غیر کیلاش سے شادی کر لے یا کوئی عورت کیلاش کا مخصوص لباس پہننے سے انکار کر دے تو اسے اپنی برادری سے خارج کر دیتے ہیں۔

کیلاش کے لوگ موسم میں سردی کی شدت کے باعث ایک کمرے کا چھوٹا سا مکان بناتے ہیں ' جس میں داخلے کا دروازہ بھی تنگ ہوتا ہے۔ اس کمرے کے درمیان میں آتش دان ہوتا ہے جس میں وہ کھانے پکانے کا کام کرتے ہیں اور رات کو اسی کے اردگرد زمین پر بستر بچھا کر سو جاتے ہیں' کئی کئی مہینے تک نہانے یا چہرہ دھونے سے اجتناب کرتے ہیں' جس کے سبب ان کے چہرے پر میل یا دھوئیں کے اثرات نظر آتے ہیں۔

کیلاش میں تعلیم' سیاحوں کی کثرت اور معیشت کے دیگر وسائل متعارف ہو جانے کے بعد یہاں کے تہذیب اور ثقافت کو کئی خطرات لاحق ہو گئے ہیں' مقامی لوگوں کی خواہش ہے کہ یہاں پر آنے والے سیاح مقامی آبادی کے تہواروں میں دخل انداز ہونے کے بجائے انہیں فاصلے سے دیکھیں۔

انشائیہ

پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی

# نہیں

وزیر: ''عالم پناہ! فتح مبارک۔ کیا اب اجازت ہے کہ لشکر کو چھاؤنی میں بھیج دیا جائے؟''

بادشاہ: نہیں'۔

وزیر (کچھ دنوں بعد) جہاں پناہ! دوسرا ملک فتح ہو گیا۔ کیا اب اجازت ہے کہ لشکر ہتھیار کھول دے؟''

بادشاہ۔ نہیں۔

وزیر: (ایک مہینے بعد) ''فلک بارگاہ! تیسرا ملک فتح ہو گیا کیا اب۔۔۔۔

بادشاہ: نہیں'۔

وزیر (تین مہینے بعد) جلالت مآب تین ملک اور فتح ہو گئے کیا اب۔۔۔

بادشاہ: نہیں۔

وزیر (ایک سال بعد) شاہ گردوں وقار' سلطان سپہر تخت'۔

شہنشاہ آفتاب علم! آدھی دنیا فتح ہو گئی کیا اب لشکر کو۔۔۔

بادشاہ: نہیں۔

---------

قیس کا باپ: ''سردار! قیس کو اپنی فرزندی میں لے لیجئے''۔

لیلیٰ کا باپ۔ نہیں۔

قیس کا باپ: ''معزز سردار لیلیٰ کو میری بیٹی بنا دیجئے''۔

لیلیٰ کا باپ۔ نہیں۔

قیس کا باپ۔ عظیم سردار ٹوٹے دلوں پر مرہم رکھ دیجئے فلک شگاف فریادوں کو مسکراہٹوں میں بدل دیجئے۔ قیس مجنوں بن گیا اس دیوانے کی حالت زار پر رحم کیجئے اسے گلے لگا لیجئے۔

لیلیٰ کا باپ۔ نہیں۔

---------

بیربل (بچے کی طرح زمین پر لوٹتے ہوئے) ہاتھی منگاؤ۔

اکبر۔ گھوڑا منگا دوں۔

بیربل۔ نہیں ہاتھی۔

اکبر۔ نہیں گھوڑا۔

اکبر ہاتھی لانے کا حکم دیتا ہے۔ ہاتھی آجاتا ہے۔

بیربل۔ لوٹا منگاؤ۔

اکبر۔ پیالہ منگا دوں۔

بیربل۔ نہیں لوٹا۔

اکبر۔ نہیں پیالہ۔

بیربل۔ نہیں لوٹا۔

اکبر لوٹا منگا دیتا ہے۔

بیربل۔ ہاتھی کو لوٹے میں بند کرو۔

اکبر۔ نہیں۔

بیربل۔ نہیں بند کرو۔

اکبر۔ ضد چھوڑ دو بچہ۔

بیربل۔ نہیں ہاتھی کو لوٹے میں ۔۔۔ لوں لوں لوں۔

---

یہ مثالیں کچھ حقیقی کچھ فرضی' ایک لفظ کے گرد گھومتی ہیں ''نہیں''۔ یہ چار حرفی لفظ ہے۔ بولو تو نون غنہ غائب۔ سہ حرفی بولا جاتا ہے لکھو تو نہایت کم جگہ گھیرتا ہے۔ بظاہر کتنا سادہ' بے ضرر' شریفانہ اور مسمسا سا لفظ لگتا ہے لیکن اللہ رے اس کی قوت' اس کی معنویت' اس کے معنوی امکانات اس کی تخریبی صلاحیت یوں لگتا ہے جیسے ایٹم بم اور ہائیڈ روجن بم اس لفظ کے سامنے پانی بھرتے ہیں اور کان پکڑتے ہیں۔

دنیا میں نفرت' جنگ' تصادم' ضد اور مخالفت کے سارے شجر اسی ایک بیج سے پھوٹتے ہیں۔ ایک بادشاہ ایک سر پھرا فاتح اپنی فتوحات اور توسیعات کا آغاز اسی ایک لفظ ''نہیں'' سے کرتا ہے سارے اخلاقی ضابطوں' سماجی سمجھوتوں' مذہبی قدروں اور انسانی رابطوں کو پس پشت ڈال کر وہ کہتا ہے ''نہیں مجھے کوئی شرط کوئی سمجھوتہ قبول نہیں''۔ آگے بڑھو۔ حملہ کرو اینٹ سے اینٹ بجا دو۔ چھوٹی چھوٹی نفرتیں' خود غرضیاں' انائیں' رقابتیں' نہیں' کا مہلک اور آتش بار ہتھیار ہاتھ میں لے کر عالمی جنگوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ تب ہولناک

تباہیوں کے بعد انسانی لاشوں، لہو کے دریاؤں اور ہڈیوں کے پہاڑوں پر کھڑے ہو کر ایک فاتح حیوانی رقص کرتا ہے اور کہتا ہے نہیں ایک اور عالمی جنگ۔

معاشرت کے سارے قضیے، ساری الجھنیں، سارے مسئلے اور ساری چپقلشیں اسی ''نہیں'' کی کوکھ سے جنے ہوئے اخوان الشیاطین ہیں۔ نہیں، کا لفظ عام طور پر غلط احساس انا سے پیدا ہوتا ہے اپنی شخصیت کا برخود غلط تجزیہ جس کے پس منظر میں دوسرے کی شخصیت اور اس کی رائے کو مسترد اور ناپسند کرنے کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے تاکہ اپنی شخصیت اور اپنی رائے منوائی جائے۔ ایسا شخص بخوبی جانتا ہے کہ میں غلطی پر اور فریق مقابل حق پر ہے اس کے باوجود یہ شخص اچانک نہیں کہہ کر منفی رویے کا اعلان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے آیئے مل جل کر پیار محبت سے جئیں ''جیو اور جینے دو'' کا اصول تسلیم کرلیں۔ اپنی اپنی سرحدوں تک محدود رہیں یہ شخص ایک دم بھبک کر کہتا ہے ''نہیں۔'' بعض اوقات اپنی طاقت کا زعم اور دوسرے کی کمتری کا احساس ''نہیں'' کا روپ دھار لیتا ہے۔

''او! بکری تو خاک کیوں اڑا رہی ہے؟''

''حضور! کشتی میں خاک کہاں؟''

''نہیں، خاک ہے تو برابر اڑا رہی ہے''

''حضور مالک ہیں جو فرمائیں ورنہ حقیقت تو یہی ہے کہ کشتی میں خاک کہاں'' ''اچھا کیا ہم جھوٹ بول رہے ہیں؟'' ٹھہر تجھے اس گستاخی کا مزا چکھاتے ہیں۔'' بڑا پودا سوچتا ہے میں بڑا ہوں، بہت بڑا اور یہ میرے سایے میں پلنے والا حقیر پودا مجھ سے کمتر ہے چھوٹا پودا عرض کرتا ہے'' حضور مجھ پر اپنا سایہ رکھئے''۔ بڑا پودا انا زدگی کے عالم میں کہتا ہے کہ ''نہیں'' اور چھوٹا پودا سوکھ جاتا ہے۔ مر جاتا ہے اس لئے کہ بڑے کی ''نہیں'' نے چھوٹے کا لہو پی لیا۔۔۔ ہر مگر مچھ چھوٹی مچھلی کو تحفظ دینے سے انکار کر دیتا ہے'' اے پانی کے بادشاہ! میں حقیر سی مچھلی تیری رعیت ہوں میری حفاظت کر''۔ پانی کا بادشاہ احساس انا کے ساتھ عالم جلال میں ''نہیں'' کہتا ہے اور یہ لفظ ادا کر کے ایک لمبا سانس اندر کی طرف کھینچتا ہے اور اس کی بہت سی رعایا اس کے پیٹ میں چلی جاتی ہے جب ''نہیں'' لوگوں کے ذہن میں سرطان کی طرح جڑیں جما لیتا ہے تو انسانیت حیوانیت بن جاتی ہے، سیاست فریب کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے، مذہب تعصب کا بھیس بدل لیتا ہے اور بستیاں جنگل بن جاتی ہیں۔ پوری تاریخ کا وجود اس تلوار سے لہولہان ہے۔ جو ''نہیں'' کے فولاد سے تیار ہو کر خون آشامیاں کرتی رہتی ہے، دنیا کے کسی ملک کی تاریخ کے اوراق کھول لو، بے شمار لڑائیاں، ہر لڑائی میں سینکڑوں

ہزاروں مقتولین کی لاشوں کے انبار' کٹے ہوئے سر بازو ہاتھ' ٹانگیں' ناک' کان' انگلیاں جیتے جاگتے ہنستے مسکراتے' چہکتے' مہکتے' انسان ذرا سی دیر میں گوشت خون اور ہڈیوں کا ایک بے جان اور عبرت ناک گورستان! رنگ' نسل' ذات پات' قبیلے خانوادے فرقے عقیدے اور ان کے درمیان تصادم' تباہی ہی تباہی' منافرت ہی منافرت' یہ سارا کرشمہ بلکہ سارا ہولناک کھیل ''نہیں'' کا ہے تیر کمان اور تلوار بندوق سے لے کر آج تک ایجاد پسند ذہنوں نے جتنے تباہ کن اور قیامت آفریں جنگی ہتھیار بنائے ان سب ہتھیاروں کی ساخت ''نہیں'' کی مکروہ دھات سے ہوئی ہے جب سسکتی کراہتی دم توڑتی انسانیت بڑی طاقتوں سے کہتی ہے خدا کیلئے اسلحہ میں تخفیف کرلو۔ ایٹمی ہتھیاروں پر پابندی لگادو۔ سارے بم سمندر میں غرق کردو تب بڑی طاقتیں پل بھر کو مل بیٹھتی ہیں اور پھر لب گور انسانیت کے کانوں تک وہی ہولناک اطلاع پہنچتی ہے۔ کہ سمجھوتہ نہیں ہوسکا اس لئے کہ بڑی طاقتوں کے درمیان ایک خلیج حائل ہوگئی تھی وہی خلیج جس کا نام ہے ''نہیں''۔ ویت نام' الجزائر' فلسطین' کشمیر اور اسی طرح کی دوسری مظلومیتیں خواب دیکھتی رہتی ہیں امن کا محبت اور پیار کا' انسانی حقوق کا' لیکن جب آنکھ کھلتی ہے خواب والی مظلومیت بڑے کرب کے ساتھ کہتی ہے نہیں یہ تو خواب تھا محض خواب۔

یہ تو بڑے پیانے پر بلکہ عالمی پیمانے پر ''نہیں'' کی کارفرمائیاں اور کرشمہ سازیاں ہیں' چھوٹی چھوٹی جگہوں' ننھے منے گھروں بلکہ گھروندوں' گلی کوچوں' مکانوں' دکانوں' کھیتوں' باغوں' ملوں اور کارخانوں میں ''نہیں'' اپنے جہنمی شعلے بکھیرتا اور امن پسند زندگیوں کو راکھ کرتا رہتا ہے سرمایہ داری' جاگیرداری' زمیں داری کو کس فورس نے جابرانہ نظام بنایا۔ یہ طبقاتی کشمکش' یہ آجر اور اجیر کے درمیان کٹا چھنی' یہ سرمایہ دار اور مزدوروں کے درمیان خلیجیں' یہ ظالم اور مظالم کے خلاف ردعمل سب کی بنیاد اس ذہنیت پر ہے کہ طاقتور کہتا ہے ''نہیں میں کمزور کے حقوق پورے نہیں کروں گا''۔ یہ جو زمیندار سردیوں کی ٹھر اور گرمیوں کی جاں گداز تپش میں کسانوں سے دن دن بھر کام لے کر ان کو پوری اجرت نہیں دیتا' یہ جو امین یتیم کا مال کھا جاتا ہے یہ جو مالک چینی کی ایک پیالی ٹوٹنے پر نوکر کو مار مار کر ادھ موا کر دیتا ہے اور نقصان پر اس کی پوری تنخواہ کاٹ لیتا ہے یہ جو پبلشر مصنف کی خون جگر سے لکھی ہوئی تصنیف کو دھڑا دھڑ چھاپ کر اپنی تجوریاں بھرتا ہے اور مصنف خون تھوکتے تھوکتے مرجاتا ہے' یہ سب عذاب انسانیت پر اس ''نہیں'' کا مسلط کیا ہوا ہے۔ اپنے اقرار وجود کے ساتھ دوسرے کی نفی کا گھناونا شرمناک اور انسانیت سوز رویہ' یہ گھروں میں معمولی معمولی بات پر تنازعے جن کے پس منظر میں ہر شخص اپنے غلبے اور دوسرے کی مغلوبیت کا خواہاں ہے اور چاہتا ہے کہ جو اس کے بس میں

ہے اس کے سینے میں ''نہیں'' کا خنجر اتار دے' نئی اور پرانی نسل میں رسہ کشی۔ باپ کہتا ہے نہیں تمہیں میرے طریقوں اور میرے اصولوں پر چلنا ہوگا۔ بیٹا کہتا ہے نہیں آپ نئی تہذیب کا مطالعہ کریں' اسے اور مجھے سمجھیں اور میرے پیچھے پیچھے چلیں' شوہر کہتا ہے ''میں تیرا مالک ہوں تیرا خدائے مجازی'' بیوی کہتی ہے ''نہیں ہرگز نہیں'' شوہر للکارتا ہے نہیں تو بکتی ہے تجھ پر طلاق۔۔۔ محلے والے شوہر سے کہتے ہیں برادر! طلاق نہ دو' غصہ تھوک دو رجوع کرلو'' شوہر چیخ کر کہتا ہے ''نہیں نہیں نہیں طلاق طلاق طلاق''۔

ہمارے محلے میں ایک شوہر اور بیوی کے درمیان چخ ہوگئی' شوہر نے ہلکا سا چپت جما دیا عورت نے اپنے شیر خوار بچے کو پٹخ دیا اور کہا اسے قیامت تک دودھ نہیں پلاؤں گی بچہ دودھ کے بغیر بلکتا رہا۔ شوہر نے کہا۔ دودھ پلا دے بچے کو۔

نہیں پلاؤں گی' عورت کی انا میں چھپے ہوئے ''نہیں'' نے چیخ کر کہا۔

میں کہتا ہوں' پلا دے بھاگوان۔

نہیں۔

خدا کے لئے پلا دے۔

نہیں۔

آخر شوہر نے ہاتھ جوڑے۔ منتیں کیں۔ پاؤں پڑا۔ تب ''نہیں'' کے خنجر کی نوک کند ہوئی ہر راج ہٹ' تریا ہٹ اور بال ہٹ اسی ''نہیں'' کا مظہر ہے' بھرے پرے خاندانوں' چہکتے مہکتے ملکوں اور جیتے جاگتے دلوں کی تباہی کا نقطۂ آغاز یہی خونیں لفظ ہے لیلیٰ مجنوں' وامق عذرا' شیریں فرہاد' سوہنی مہینوال' رومیو جولیٹ اور ایسی کتنی ہی داستانوں کی خونیں تخلیق اسی ''نہیں'' کی مرہون منت ہے' کیسے کیسے خوبصورت دل' بیر بہوٹی جیسی تمنائیں نرم و نازک شگوفوں جیسی چاہتیں اور ریشمی زندگیاں اسی نہیں کی دار پر لٹک گئیں محبت کی ناکامیاں' محرومیاں اور قربانیاں اس ضد' نفرت' رقابت اور سفا کی کا نتیجہ ہیں جو ''نہیں'' کے تخم سے پھوٹی ہیں۔

اس ظلم ''نہیں'' کی تاریخ ولادت کیا ہے؟ یہ انسانی زندگی کے ہرے بھرے درخت کا پیرا سائٹ کب وجود میں آیا؟ یہ کوئی آسمانی بلا تو نہیں جو اہل زمین پر مسلسل نازل ہو رہی ہے' ہاں ایسا ہی ہے' ازل کے دن جب آدم وجود میں آئے ایک آدم دشمن قوت نے اپنی بدخواہی کے بطن سے اس سپولیے کو جنم دیا تاکہ یہ لگا تار اولاد آدم کے ذہن کو ڈستا رہے۔ ازل کے دن ایک پر از جبروت آواز آسمانوں کی فضائے بسیط میں گونجی۔

''آدم کو سجدہ کیا جائے'' سب کے سر سجدے میں جھک گئے لیکن ایک سرکش آواز ابھری ''نہیں''

کیونکہ آدم مٹی سے بنے ہیں۔میری تخلیق آگ سے ہوئی ہے میں آدم سے برتر ہوں تب ''نہیں'' کا شعلہ ابھرا' پھیلا اور اس قدر پھیلا کہ پوری انسانی کائنات اس کی لپیٹ میں آ گئی۔لیکن جلد ہی ایک اور متصادم قوت ابھری ''نہیں'' کے خلاف شر نفرت' اور جنگ کے خلاف' تب سے ہر دور میں چراغ مصطفویؐ کے ساتھ شرار بولہبی کی ستیزہ کاری جاری ہے' تب سے ایک طبقہ ''نہیں'' کے منفی پہلوؤں سے برسرِ پیکار ہے اور اس کے مثبت امکانات کو چمکانے میں کوشاں ہے' سارا مسئلہ ذہنی رویے کا ہے ''نہیں'' ایک منفی عمل سہی ایک انکار ایک Rejection ایک تلوار' ایک زہر سہی لیکن زہر دوا کا حصہ بن کر انسانی جان کو بچا بھی سکتا ہے' تلوار مظلوم کی حمایت میں بھی تو بلند ہو سکتی ہے' بس ایک ذہنی تبدیلی' ایک خوبصورت سا' ملائم سا' ریشمی سا خیال ''نہیں'' کے راستے ہر قدم رکھ کر ''ہاں'' کی منزل بھی تو سر کی جا سکتی ہے۔صوفیائے کرام 'لا' سے سفر کا آغاز کرتے ہیں اور الا اللہ کی مثبت منزل پر جا کر کمر کھول دیتے ہیں۔جب کوئی محبوب ''نہیں'' کہتا ہے تو اس عدم سے اس کے ذہن کا وجود اور اس کا اقرار مثابت ہو جاتا ہے' وہی نفی سے اثبات کا سفر'

دی ہے جائے دہن اس کو دم ایجادِ ''نہیں''   نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا

اس ''نہیں'' کے خاربن سے اقرار و ایجاب کے سدا بہار پھول بھی تو کھلتے ہیں ''میں تم سے محبت کرتا ہوں۔کیا تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو؟ نہیں'' اور نہیں کہتے وقت محبوبہ کی شرمائی ہوئی آنکھیں سپردگی کے جذبے سے کس قدر سرشار ہوتی ہیں۔

''امی! حلوا دیجئے۔بس تھوڑا سا''

''شریر کہیں کا' تجھے اب حلوا نہیں ملے گا'' اور ماں کے شفقت بھرے ہاتھ حلوے کا پورا مرتبان بیٹے کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔

استاد محبت آمیز غصے سے شاگرد کو ڈانٹا ہے۔

''نالائق! تو پاس نہیں ہو گا کیونکہ تو محنت نہیں کرتا''

اور اس نہیں بھرے لہجے کا مطلب نکلتا ہے تو ضرور پاس ہو گا' بس ذرا محنت کی عادت ڈال لے بیٹا۔

وہ تاریخ جس کا سینہ ''نہیں'' کے خنجر کی دھار سے زخمی ہے' وہیں' اسی تاریخ کی پیشانی پر یہ واقعہ بھی ستارے کی طرح جگمگ جگمگ کر رہا ہے۔''یا امام! اہل کوفہ بد عہد ہیں۔آپ خدا کے لئے کوفہ جانے سے رک جایئے''۔اور امام پر اعتماد لہجے میں جواب دیتے ہیں: ''نہیں''

پروفیسر خاطر غزنوی

# نیا زاویہ قائمہ

ن م راشد ہر لحاظ سے ایک شدت پرست شخص تھا خانگی زندگی' دفتری زندگی' نظریات' شاعری دوستوں سے رویہ' دشمنوں پر نظر چیتے کی طرح تھی وہ منتقم' لالچی' پیسے کے حصول کے لئے ہر حربہ استعمال کرنے والا' زندگی کا رویہ' موت کا تصور' ہر بات میں وہ ایک نئے زاویے کا مالک تھا۔ جس کے ڈانڈے زاویہ قائمہ سے ملتے تھے۔ زاویہ قائمہ اس لئے کہ وہ اپنی سوچ کو حرف آخر سمجھ کر اس پر قائم رہتا تھا۔

والد چونکہ استاد تھے اس لئے تعلیم کا حصول اس کے لئے مسئلہ نہ تھا۔ وہ نرم دل نہ تھا بلکہ غالب کی طرح محبوبہ کو مار کر رکھنے کا قائل تھا گھر یا باہر ہرن کا شکار کر کے اسے فریزر میں دیر تک تازہ رکھنے کا قائل تھا لیکن آخر آخر وہ خود کسی نئی سوچ کے زاویے کے تحت بوڑھوں کی بستی کے فریزر میں چلا گیا اور پھر فریزر سے آگ پر گرم ہو کر راکھ کی ڈھیری بن گیا۔

دوسری جنگ عظیم میں اسے فوج کے شعبہ اطلاعات میں ملازمت ملی۔ وردی اور بھاری بوٹ اسے پہننے پڑے بوٹ اس کے پاؤں سے اس طرح چمٹے کہ فوج سے فارغ ہونے کے بعد بھی راشد کیپٹن ہی رہا۔ وہ چلتا تو زمین کو اس طرح کچلتا ہوا آگے بڑھتا گویا زمین اس کی دشمن ہے۔ اور یہ زاویہ قائمہ موت کی وصیت بن کر برقرار رہا کہ اس نے زمین کی گود میں جانا پسند نہ کیا بلکہ مشین میں ادھر مردہ رکھا اور دوسری طرف اس کا قیمہ بھی نہ بنا راکھ کی چھوٹی سے ڈھیری نمودار ہو گئی اور اب راشد کی راکھ ایک مرتبان کا رزق ہے اگر اسے جلایا نہ جاتا اور اس کی لاش کو مسالے لگا کر محفوظ کر لیا جاتا تو وہ ایک ہیبت ناک ممی ثابت ہوتا۔

فوج کی نوکری کے بعد راشد کو ریڈیو میں ملازمت مل گئی اور اس نے تصدق حسین خالد کا تتبع کرتے ہوئے آزاد شاعری کا آغاز کر دیا۔ راشد چونکہ ہمیشہ کیپٹن رہا اور ہمیشہ بھاری بوٹوں کا مرہون منت رہا اس لئے وہ صنف نازک کو نازک جذبات سے نہیں نوش جان کرنے کے طریقے سے آگاہ رہا۔ میں اسے محبت نہیں کہوں گا کہ محبت کے لئے بھی اس نے نیا زاویہ اختیار کر لیا تھا۔ اچھے تعلقات یا برے تعلقات اور بس۔۔۔ وہ

درمیانی راستے کا قائل نہ تھا۔

دوسروں سے کام لینا ضرور لیتا لیکن اس کو ان کے لئے کوئی قربانی دینی ہو یہ ممکن نہ تھا۔ میرے ساتھ جو بیتی اس کا تذکرہ کروں گا۔ راشد کو یو این او ریڈیو میں ڈیپوٹیشن پر بلایا گیا اس وقت وہ پشاور ریڈیو میں اسٹیشن ڈائریکٹر تھا مجھے ہدایت کی کہ پاکستان کے اہم ادبی رسالے باقاعدگی سے اسے بھیجتا رہوں میں نے آمنا وصدقنا کہا' رسالے بھیجنے شروع کئے پھر وہ اپنی نظمیں بھجواتا اور حکم دیتا کہ اچھے رسالوں کو بھیجتا رہوں میں نے یہ کام بھی کیا' پھر ارشاد ہوا کہ ان کی ایران کے بارے میں شاعری کی کتاب ''ایران میں اجنبی'' کا کسی پبلشر سے شائع کرنے کا معاہدہ کروں۔ میں نے مرحوم مبارک علی سے گوشہ ادب لاہور کے تحت کتاب کی اشاعت کی بات کی' معاہدہ پبلشر سے دستخط کرایا اور راشد کو امریکہ بھیجا۔ اس کے بعد بھی اس کے خطوط میں شکوک و شبہات اور رائلٹی کے خورد برد ہونے کا خدشہ سامنے آتا رہا۔ دراصل چودہری برکت علی نے ماورا شائع کر دی دوسرے غریب اور بے بس اہل قلم کی رائلٹی ہضم کی' راشد کو بھی چھوٹا گوشت سمجھا کہ جلد ہضم ہو جائے گا لیکن یہ تو موٹا گوشت جمع فوجی بوٹ تھا۔ راشد نے چودہری برکت علی پر دعوئ دائر کر دیا اور رائلٹی حاصل کر کے دم لیا۔ آخر میں نے ملک مبارک سے ذاتی تعلقات کی بنا پر رائلٹی کی رقم پیشگی لے کر راشد کو بھجوادی تب وہ مطمئن ہوا۔

ان ہی دنوں میرا رسالہ زندگی شائع ہو رہا تھا میں نے سوچا اسے راشد نمبر بنایا جائے۔ میں نے راشد کی تصاویر' راشد پر مضامین اکٹھے کئے اور اس کی تازہ وصول شدہ نظم صبا ویراں بھی شامل کر لی اور راشد کو لکھا کہ میں اسے راشد نمبر میں شامل کر رہا ہوں' اس نے جواب میں جھاڑ پلائی کہ زندگی بھی کوئی رسالہ ہوگا۔ یہ نظم کسی دوسرے اچھے رسالے کو بھجوا دو اور اگر شائع کرنے پر مصر ہو تو اس کا معاوضہ ادا کرو۔ راشد کی شاعری تصدق حسین خالد سے پہلے شائع ہو گئی ماورا کی اشاعت سے راشد کو آزاد شاعری کا امام سمجھا جانے لگا۔ حقیقت یہی ہے کہ اس نے آزاد شاعری کو نیا زاویہ بخشا۔

راشد کی شاعری کو اس کے دو مرتبہ ایران جانے سے بڑی تقویت ملی پہلی مرتبہ وہ دوسری جنگ عظیم کے دوران ایران اور ایران کی زندگی اور ثقافت سے نہ صرف متاثر ہوا بلکہ فارسی زبان کو بھی اپنے اوپر مسلط کر لیا۔ راشد کی شاعری فارسی زبان و محاورہ سے مزین ہے اور یوں اردو شاعری جو پہلے بھی فارسی شاعری کی مرہون منت تھی نئے زاویئے سے فارسی زبان و ادب و ثقافت سے آشنا ہوئی اور اس کے ایران پر کیفو اردو

ادب کا تاریخی سرمایہ بن گئے۔

وہ عام طور پر ابھرتے ہوئے یا اچھے شاعروں کا ازل سے مخالف تھا مثلاً احمد ندیم قاسمی جو اتفاق سے راشد کی اسسٹنٹ ڈائریکٹری کے زمانے میں پشاور ریڈیو میں سجاد سرور نیازی کی محبت کی وجہ سے منسلک تھے راشد ان سے بہت چڑتے اور ان کی نظموں کے مصرعے نکال نکال کر ان کا مذاق اڑاتے۔ مثلاً ندیم کے ایک مصرعے کو مذاق کا موضوع بنایا اور ''بدن کے تار جھنجھنا اٹھے'' کی ترکیب کا حد سے بڑھ کر مذاق اڑایا۔ وہ کہتا بدن نہ ہوا رباب ہو گیا کہ اس کے تار بھی جھنجھناتے ہیں۔۔۔ راشد کا یہ مذاق بھونڈا تھا یا صحیح ہر صاحب ذوق اس کا فیصلہ اپنی حس لطیف سے کر سکتا ہے۔

راشد کی خوبیوں میں ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ مطالعے کا بڑا شوقین تھا۔ میرے ساتھ اس کی یاری تھی میں اس کے گھر بھی جاتا اس کے مرحوم بیٹے شہریار کی بعض تقریبات کا اہتمام بھی میں نے کیا۔ مجھے راشد کے باتھ روم میں بھی ایک منی لائبریری نظر آئی۔ وہ ہر پسندیدہ شخص کو مطالعے کی تلقین کرتا۔

شاعری اور ادب اور ریڈیائی معاملات میں وہ اپنے ہم زلف مختار صدیقی کا بڑا قائل تھا اور اکثر مختار صدیقی کو پشاور بلواتا اور ریڈیو کے پروگراموں کی ترتیب اور نئے نئے آئیڈیا اس سے لیتا۔ راشد نے مطالعے اور ریڈیو پروگراموں کو بہتر بنانے کے لئے پشاور ریڈیو میں بڑے بڑے اچھے اچھے کام کیے مثلاً وہ ہر مہینے پروڈیوسروں' مسودہ نگاروں اور ریڈیو کے ادیبوں' شاعروں کی ایک میٹنگ بلاتا اور سب حاضرین سے ریڈیو پروگراموں کے لئے نئے نئے آئیڈیا لیتا۔ لوگ اپنے خیالات کا اظہار کرتے اور سٹینو ان کو قلم بند کرتا رہتا۔ پھر یہ سب کچھ ایک روداد کی صورت ٹائپ ہوتا۔ جو پروگرام اور ان کے آئیڈیا اچھے ہوتے وہ بعض پروڈیوسروں کے ذمہ لگائے جاتے کہ وہ یہ پروگرام اور ان کے آئیڈیا اچھے ہوتے وہ بعض پروڈیوسروں کے ذمہ لگائے جاتے کہ وہ یہ پروگرام نشر کرنے کا اہتمام کریں جن خیالات کا حصول ممکن نہ ہوتا یا ریڈیو کے پاس اس کے وسائل نہ ہوتے ان پر معذرت کر دی جاتی۔

دوسرا کام ریڈیو کی مجلس ادب تھی جس کا سیکرٹری ہونے کا اعزاز مجھے حاصل تھا ایک سال کے کامیاب جلسوں کے بعد اس کی سالانہ تقریب منانے کا اہتمام کیا گیا اور اس موقع پر مہمانوں کو لنچ دیا گیا۔ لنچ کا اہتمام بھی میرے ذمے تھا لیکن راشد کی شکی طبیعت نے سب متعلقہ لوگوں کو دفتر میں طلب کیا ایک ایک سے کھانوں' برتنوں' ڈائننگ ٹیبلوں عمدہ کرسیوں کی بات ہوئی اسرار حسین اس زمانے میں پشاور ریڈیو میں

پروگرام سیکرٹری تھے انہوں نے کراکری کا ذمہ اٹھایا۔

اس سالانہ تقریب میں سرحد کے گورنر خواجہ شہاب الدین' اسلامیہ کالج کے پروفیسر محمد موسیٰ کلیم' جسٹس محمد شفیع' پشاور کے ادباء' شعراء اور بعض محکموں کے سربراہوں کو دعوت دی گئی۔ جب دعوت شروع ہوئی تو راشد کا منہ لٹک گیا کسی ڈونگے کا سرپوش ٹوٹا ہوا تھا' کسی پیالے کے کنڈے نہ تھے' غرض ٹوٹی ہوئی کراکری نے ہماری گردنیں جھکا دیں دوسرے دن راشد نے اسرار حسین کو طلب کیا اور پوچھا کیا تمہیں یہی ٹوٹی ہوئی کراکری لانی تھی' اسرار حسین بڑا حاضر جواب تھا' اس نے کہا آپ نے کون سے ثابت وسالم لوگوں کو دعوت پر بلایا تھا۔ گورنر صاحب کی آنکھیں پھری ہوئی تھیں۔ موسیٰ کلیم ایک ٹانگ سے محروم تھے جو خود ادھورے ہوں وہ ادھورے یا ٹوٹی پھوٹی کراکری پر اعتراض نہیں کر سکتے۔ راشد کی خوش ذوقی نے ایک قہقہے میں بات کو ٹال دیا۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ صنف لطیف راشد کی کمزوری ضرور تھی یہ دوسری بات ہے کہ وہ محبوبہ کو مار کر رکھتا تھا۔ وہ اسٹیشن ڈائریکٹر ہو کر آیا اور اپنے کمرے میں بیٹھا ہی تھا کہ پیچھے سے ایک نسوانی آواز آئی ''مے آئی کم اِن سر'' راشد کی باچھیں کھل اٹھیں وہ ریوالونگ کرسی کو اچانک گھما کر اپنے پچھلے دروازے کی طرف مڑا' وہاں ایک سیاہ فام مرد نوجوان کھڑا تھا وہ سیاہ فام مرد پشاور ریڈیو کا اکاؤنٹنٹ تھا راشد کی حس لطیف پر اوس پڑ گئی۔

راشد نے یو این او میں اپنا گھر پشاور میں لکھوایا تھا اس لئے اسے یو این او سے پاکستان میں پشاور تک کا جہاز کا ٹکٹ ملا کرتا تھا۔ اس لئے وہ جب بھی پاکستان آیا پشاور کا چکر اس نے ضرور لگایا وہ اپنی دوسری مغرب نژاد بیوی کو بھی پشاور لاتا اور میڈم پشاور کے تحفے بٹور کر لے جاتی لیکن شکریے کا کوئی خط لکھ نہ پاتی۔

راشد ایک قد آور گٹھے ہوئے جسم' باقاعدگی سے پریڈ کے انداز میں ہلتے ہوئے ہاتھوں اور بوٹوں کی دھمکار کا مجموعہ تھا اس کے بارے میں شوکت تھانوی نے شیش محل میں یہ لکھا کہ وہ آتا نظر آئے تو معلوم ہوتا ہے کہ طاعون کا ٹیکہ لگانے والا شخص آ رہا ہے۔ راشد فارغ البال تو نہ تھا' ایک بیٹا شہریار اور دو بیٹیاں بھی تھیں۔ لیکن سر کے بالوں سے ضرور فارغ تھا ایک پتلی سی لٹ ضرور تھی جسے وہ ماتھے پر ڈال کر ماتھا ڈھانپنے کی ناکام کوشش کرتا' بالکل اسی طرح جیسے امجد اسلام امجد اپنی جوانی کے دنوں میں ماتھے پر لٹ ڈال کر اپنے گنجے پن سے انتقام لینے کی ناکام کوشش کرتا رہا ہے۔ ایک دن راشد آئینے کے سامنے کھڑا اس لٹ پر کنگھی پھیر رہا تھا کہ شہریار نے قہقہہ لگایا' راشد فوجی انداز میں رائٹ ٹرن ہو کر شہریار کی طرف دیکھنے لگا بیٹے نے ابو سے کہا ''ابو جی جھوٹ موٹ کی کنگھی کر رہے ہیں'' راشد کا چہرہ سڈول تھا' آنکھیں چھوٹی چھوٹی لیکن دوربین' سر کو اس نے

فوج کے زمانے میں فوجی ٹوپی کے سہارے چھپائے رکھا۔
اس کے ہونٹ کھلتے تو گول ہو جاتے جن میں کوئی بھی بوتل فٹ آسکتی تھی۔ لیکن اسے بوتل سے شغف کرتے کم ہی دیکھا گیا لئے دیئے رہنے والا' اجنبیت کو پسند کرنے والا صرف چند ہم ذوق دوستوں سے کھلتا۔ راشد کے الفاظ کی ادائیگی میں ''ر'' کی شدت بڑی واضح تھی وہ ہر طرح کی ''ر'' پر شد لگاتا بھرر پوررا (بھر پور) کررتا (کرتا) بزررگ (بزرگ) کرایہ (کرایہ) رراشد (رراشد) کی ادائیگی میں ''ر'' ہر حرف پر غالب آتی یوں تو بعض لوگوں کی گفتگو میں ''ر'' غائب ہوتی ہے چینیوں نے ''ر'' کا جھنجھٹ ہی نہیں پالا وہ ''ر'' کی بجائے حرف ''ل'' کا استعمال کر کے اپنی زبان کی قدامت کی تتلاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن راشد تتلاہٹ سے پرے ''ر'' کو صرف رنہیں شدید ''ر'' بناتا۔
راشد خود بھی شدید تھا اندر سے شاعر باہر سے لفٹ رائٹ کرتا ہوا فوجی۔۔۔

## سید رفیق عزیزی

# الحمد

نورِ مطلق اپنا خود رکھا جمال اندر جمال
ذرّے ذرّے میں نظر آیا جمال اندر جمال

تیری یکتائی کا منکر کوئی کیسے ہو سکے
اپنے جلوے کو رکھا یکتا جمال اندر جمال

ہے تقاضا ' ذات بے ہمتا مجھے سمجھا کرو
اور خود ہی جلو فرمایا جمال اندر جمال

اپنی ہی صورت عطا کی حضرت انسان کو
اور رکھا خود کو اَن دیکھا جمال اندر جمال

رحمتیں ہی رحمتیں چھائی ہوئی ہیں ہر طرف
آرہا ہے تُو نظر کیا کیا جمال اندر جمال

صورتِ بے صورتی تُو آئنہ تُو ' جلوہ تُو
کون ہے تیرے سوا مولا جمال اندر جمال

مجھ سے فرمایا: نظر کو رکھ فقط میرا رفیق
خود دِکھایا چہرۂ زیبا جمال اندر جمال

## نکہت بریلوی

# نعتیہ نظم

بجز سلام عقیدت کروں میں پیش تو کیا
بہت عظیم ہے وہ ذات پاکؐ میرے لیے

مری زباں میں یہ طاقت کہاں کہ کچھ بولے
مرے قلم کو مجالِ رقم کہاں کہ لکھے

صفت میں اسؐ کی کوئی حرف معتبر ایسا
جو اس کی وسعت گردوں صفت کو چھو جائے

وہؐ علم و عدل و مساوات کی علامت ہے
وہؐ دُرِّ عزم و یقیں ' پیکر شجاعت ہے

وہؐ اتقاء ہے ' توکل ہے اور عبادت ہے
وہؐ روشنی ہے ' محبت ہے اور صداقت ہے

وہؐ حق پسند ہے اور صاحب امانت ہے
وہؐ کائنات کی رونق دلوں کی راحت ہے

ہزار وصف ہیں اسؐ میں کسے بیان کروں
زمین شعر کو کیونکر میں آسمان کروں

## اختر علی خان اختر چھتاروی

# نعت رسول کریم ﷺ

نگاہِ خانۂ امکاں ہے نقشِ روئے رسول ﷺ ہر ایک نقش سے آتی ہے مشکبوئے رسول ﷺ

دلوں میں شمع جلاتی ہے آرزوئے رسول ﷺ پکڑ کے ہاتھ چلاتی ہے جستجوئے رسول ﷺ

ازل میں ذکر چھڑا، تا ابد مسلسل ہے زہے تسلسل لا منتہائے موئے رسول ﷺ

ازل سے تابہ ابد امرِ کن کا مصدر ہے یہ نورِ نورِ الٰہی، یہ نور روئے رسول ﷺ

یہی حقیقت قوسین قرب باری ہے ہے قبلہ رو رخِ کعبہ ازل سے سوئے رسول ﷺ

تمام عوالم امکاں انہی ﷺ کے پیاسے ہیں نوائے زندگی دیتی ہے آب جوئے رسول ﷺ

قسیم رحمت حق ہیں، ذرا کرم دیکھو گلوں میں بن گیا شبنم، نمِ سبوئے رسول ﷺ

نشان دولت ایماں ہے گنبد خضرا نگاہِ تشنہ کا سرمہ ہے خاکِ کوئے رسول ﷺ

خصالِ حق سے مزیّن ہے اس قدر اخلاق خدا نے خود کہی تحمیدِ خُلق و خوئے رسول ﷺ

تمام خلق الٰہی درک سے عاجز ہے خدا نے اتنی بڑھا دی ہے آبروئے رسول ﷺ

ادب نبی ﷺ کا سکھاتی ہے گفتگوئے خدا ادب خدا کا سکھاتی ہے گفتگوئے رسول ﷺ

دعا، خدا سے یہی مانگتے رہو اختر
مشامِ جاں کو میسّر ہو مشکبوئے رسول ﷺ

## سید حبیب اللہ اوجؔ

### نعت رسول ﷺ

سلام اسؐ پر خدا نے، خود محمدؐ جس کو فرمایا!
سلام اسؐ پر حبیب کبریاؐ جس نے لقب پایا!

سلام اسؐ پر کہ جس کے نام سے دل کو قرار آیا!
سلام اسؐ پر کہ ذات حق پہ جس سے اعتبار آیا!

سلام اسؐ پر کہ جس سے قیصر و کسریٰ پہ تھی لرزش!
سلام اسؐ پر کہ جس پہ ہوتی تھی انوار کی بارش!

سلام اسؐ پر کہ جس نے علم کی مشعل جلائی ہے!
سلام اسؐ پر کہ جس نے راہ عرفاں کی دکھائی ہے!

سلام اسؐ پر کہ جس سے کوئی بہتر ہو نہیں سکتا!
بجز اسؐ کے کوئی بھی داغ عصیاں دھو نہیں سکتا!

سلام اسؐ پر جہاں میں نور وحدت جس نے پھیلایا!
سلام اسؐ پر کہ جس کے جسم اطہر کا نہ تھا سایا!

سلام اسؐ پر یتیموں کو لگایا جس نے سینے سے!
گلاب و مشک کی آتی تھی بو جس کے پسینے سے!

سلام اسؐ پر کہ تھی الفقر فخری زندگی جس کی!
جہاں کو متحد کر دیتی تھی تابندگی جس کی!

وہی جس نے خطاب رحمتہ للعالمینؐ پایا!
کلام پاک لے کر عرش سے سوئے زمیں آیا

بلا لیں اوجؔ کو وہؐ جلد طیبہ کی بہاروں میں
بسر کرتا ہے جو دن رات بس اس کے نظاروں میں

## محمود رحیم

### نعت رسول ﷺ

حدِ ارض سے رفعتِ آسماں تک
جہاں حمد ہے، نعت بھی ہے وہاں تک

تجلیِ اوّل، ظہورِ موخر
تری ضوِ مکاں سے سرِ لامکاں تک

ترے پرتوِ حسن کے سلسلے ہیں
ظہورِ مجسم سے کنزِ نہاں تک

ترے اسمِ رحمت کا فیضان جاری
ابد کے یقیں سے ازل کے گماں تک

تری رحمتیں ہیں محیطِ ہر عالَم
ترا عفو شامل صفِ دشمناں تک

تری جلوہ گاہ تجلی ہے آقا
مکین و مکاں سے زمین و زماں تک

شہاں منتظر کفش برداریوں کے
ترے در کے منگتوں کا رتبہ کہاں تک

بشارت ہو تکمیل ایماں کی حاصل
تری چاہ اترے اگر جسم و جاں تک

رحیم ایک پل جس میں ذکر آپ کا ہو
دل و جان و ذہن و زبان و بیاں تک

## حکیم سرو سہارنپوری

# نعت

دور جا کر دیکھنا نزدیک آ کر دیکھنا
ہر ادا ہر چھب سے بس طیبہ کا منظر دیکھنا

میری دنیا بھی یہی ہے میری جنت بھی یہی
گنبد خضرا کے جلوے زندگی بھر دیکھنا

جذب و مستی میں نکل جانا کبھی سوئے حرم
واپسی پر پھر وہی محراب و منبر دیکھنا

چپے چپے پر انہی نقش کف پا کی تلاش
ذرے ذرے میں نزول ماہ و اختر دیکھنا

سر برہنہ پا پیادہ انؐ کے کوچے کا طواف
جب میسر ہو تو پھر میرا مقدر دیکھنا

سانس لینا انؐ کے کوچے میں میسر ہو اگر
پھر مری سانسوں سے اک عالم معطر دیکھنا

مل گیا گر سرمۂ خاک کف پائے رسولؐ
دیکھنے والو! میری آنکھیں منور دیکھنا

وقف کیجئے جسم و جاں کے سب تقاضے دید میں
دیکھئے طیبہ میں جب تک ہو میسر دیکھنا

سر جھکا کر دل کی آنکھوں سے نظارہ کیجئے
ہاں! یہاں سوئے ادب ہے آنکھ اٹھا کر دیکھنا

جبرئیل آئے جہاں اللہ کا لے کر سلام
انؐ کی مسجد کا مقام اللہ اکبر دیکھنا

سانس لینا بھی گراں پلکیں اٹھانا بھی محال
ہائے کیا عالم ہے اس عالم کا منظر دیکھنا

دست بستہ پڑھ رہا ہوں میں بھی روضہ پر سلام
ہوگیا تقدیر سے یہ بھی میسر دیکھنا

ہے انہی کی دید کی خاطر یہ جنت بھی عزیز
واں میسر ہو گا انؐ کا روئے انور دیکھنا

ہر بن مو آنکھ بن جائے تو کچھ تسکین ہو
سرؔو دو آنکھوں سے کیا روضے کا منظر دیکھنا

منظوم ترجمہ — اختر علی خان اختر چھتاروی

# کلام اسداللہ الغالب

## علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ

خَوَّفَنِیْ مُنَجِّمٌ اَخُوْ خَبَلْ — ڈرا کے بولا نجومی تہی خرد زخلل

تَرَاجَعَ الْمِرِّیْخُ فِیْ بَیْتِ الْحَمَلْ — پلٹ کے آگیا مریخ زیر برج حمل

فَقُلْتُ دَعْنِیْ مِنْ اَکَاذِیْبِ الْحِیَلْ — کہا یہ میں نے کہ جا! جھوٹے حیلے رہنے دے

اَلْمُشْتَرِیْ سَوَآءٌ عِنْدِیْ وَ زُحَلْ — مرے لیے ہیں برابر کیا مشتری کیا زحل

اَدْفَعُ عَنِّیْ نَفْسِیْ اَفَانِیْنَ الدِّوَلْ — مرے تمام مصائب کا ' کارساز ہے وہ

بِخَالِقِیْ وَ رَازِقِیْ عَزَّوَجَلْ — ہے میرا خالق و رازق خدائے عزوجل

## پروفیسر شوکت واسطی

☆

کہوں پیچیدگی کیسی تمہاری شخصیت میں ہے
زباں ہے گنگ، گویا گومگو کی کیفیت میں ہے

کہاں کا وصل، کیسی ہم نشینی، ہمکناری کیا
کہ ہے گم حسن میں خود، عشق اپنی محویت میں ہے

بدن کی طرح تم اس پر بھی من مانی چلاتے ہو
ہماری روح بھی جیسے تمہاری ملکیت میں ہے

سمندر کی خموشی میں کئی امکان پنہاں ہیں
مکمل خیر کب اے ناخدا اس خیریت میں ہے

گھلے تاثیر میں پانی کی جرثومے وبا پرور
سم آلودہ اثر داخل ہوا کی خاصیت میں ہے

ہوئی یہ عدل کی ہیئت کذائی واے اے منصف
عنایت خوں بہا بھی قاتلوں کو اب دیت میں ہے

ذہانت پائی با افراط توفیق الٰہی سے
اگر ہے نقص کچھ تفریط کا تو ذہنیت میں ہے

توجہ دی گئی نشوونما پر خوب بچوں کی
مگر اے والدین اغماض سرزد تربیت میں ہے

یہ کس میزان میں میزانیہ پھر وزن کرلائے
اضافے کی بشارت حسب سابق کمیت میں ہے

نہ حسب الامر گر حسن عمل کا ماحصل نکلے
یقین آئے، یقیناً کچھ فتور اپنی نیت میں ہے

اسی نسبت سے شوکت عقل ہے دیوالیہ اپنی
اضافہ جس تناسب سے ہماری علمیت میں ہے

## محسن احسان

☆

اب وہ اخلاص باہمی ہے کہاں
دوستی میں بھی دوستی ہے کہاں

جس کی لو دل میں ٹمٹماتی ہے
اس دیئے میں بھی روشنی ہے کہاں

سننے والا جواب تو دیتا
آسماں تک دعا گئی ہے کہاں

برق رفتار زندگی کے قدم
گردش وقت روکتی ہے کہاں

ابدی نیند کی تلاش میں ہوں
اے مری موت، مرگئی ہے کہاں

موج دریا پہ ڈوبتی کشتی
دیکھنا ہے کہ ڈوبتی ہے کہاں

کھود لاتی تھی جو پہاڑ سے نہر
ویسی اب خوئے عاشقی ہے کہاں

انتہائے عروج کے باوصف
آدمی اب بھی آدمی ہے کہاں

جس حقیقت کو دائمی سمجھا
وہ حقیقت بھی دائمی ہے کہاں

جو دیئے بجھ گئے ہیں ان کو ہوا
سر دہلیز ڈھونڈتی ہے کہاں

جیسی ٹھوکر مرے نصیب میں ہے
ویسی ٹھوکر تجھے لگی ہے کہاں

خوف در خوف شور تنہائی
خواب در خواب خامشی ہے کہاں

ہم سے پوچھو ہمارے چارہ گرو
شدت درد میں کمی ہے کہاں

ہو گئے ختم سارے ہنگامے
صحن دل میں ہماہمی ہے کہاں

جو میسر ہے اس جہاں میں ہمیں
دوسرے میں وہ زندگی ہے کہاں

## مختارالدین احمد مختار

☆

کنواری بیٹیاں چھپتیں کہاں سب گھر شکستہ ہیں
درندے پھر رہے ہیں ہر طرف اور در شکستہ ہیں

یہ انسانوں کے پیکر ہیں کہ حزن ویاس کے پُتلے
جو باہر سے نہیں ٹوٹے ہیں وہ اندر شکستہ ہیں

دعائیں گنبدوں سے سر پٹک کر لوٹ آتی ہیں
جو لے جاتے تھے نامے وہ کبوتر پر شکستہ ہیں

ابابیلوں کی کب سے منتظر ہیں مسجدیں تیری
جو جھکتے تھے نہ جھکنے کو وہ سارے سر شکستہ ہیں

ہماری کوششوں کا کیا یہی انجام ہونا تھا
جو دشمن کے سروں تک پہنچے وہ پتھر شکستہ ہیں

ہوا ہے درہم و برہم نظام ظاہرو باطن
نہ جانے آئینے ٹوٹے ہیں یا منظر شکستہ ہیں

خدا دشمن اور انساں دوست انسانوں کے ہاتھوں سے
زمیں تو کیا فضاؤں کے بھی بام و در شکستہ ہیں

ابھی تک جنبش ابرو پہ اپنی جان دینے کو
بہت سے لوگ بیٹھے ہیں مگر اکثر شکستہ ہیں

وہ جن کو چھوڑ کر آئے تھے، ہیں ٹوٹے ہوئے گھر میں
جو ان کو چھوڑ کر نکلے تھے وہ باہر شکستہ ہیں

☆

بے رخی ہو کہ طلب حد سے فزوں ہو تو غلط
بے حسی باعث آرام وسکوں ہو تو غلط

کس کے دیوانے ہوئے کیوں ہوئے کیا ہم کو خبر
آگہی شیوہ ارباب جنوں ہو تو غلط

خم کرینگے تو ہم اک بار مگر مقتل میں
زندہ رہنے کے لئے سر جونگوں ہو تو غلط

روشنی ہو کہ تپش گریہ غم ہو کہ دھواں
کسی صورت بھی عیاں سوز دروں ہو تو غلط

شمع جلتی ہے تو سو رنگ سے جتلاتی ہے
خاک پروانہ میں رنگینی خوں ہو تو غلط

شعلہء زیست کی لو میں ہے تجسس کی تڑپ
موت سے پہلے میسر جو سکوں ہو تو غلط

ہم وہ مجبور ہیں مختار کہ اپنا ہر کام
یوں اگر ہو تو غلط اور نہ یوں ہو تو غلط

## محسن بھوپالی

☆

یوں اپنی طلب میں رہ تصیر سے پہنچا
یہ فیض مجھے نفس عناں گیر سے پہنچا

قربت کے کھلا، ہے میرے حق میں سم قاتل
جو میرے قریں لذت تقریر ہے پہنچا

دو خیر کے الفاظ سے اے کاش اسے ملتا
جو دل کو سکوں فقرہ تحقیر سے پہنچا

ہر چند وسیلہ تھیں کئی اور بھی راہیں
میں اس کے تیئں نالہء شبگیر سے پہنچا

احباب کو موقع مری بدگوئی کا مل جائے
یہ سوچ کے اس بزم میں تاخیر سے پہنچا

اوروں سے مری طرز نگارش ہی الگ تھی
نقصان مجھے اپنی ہی تحریر سے پہنچا

دنیا سے ملے زخم تو سب بھر گئے محسن
جو زخم مگر اپنی ہی شمشیر سے پہنچا

## محسن احسان

☆

شعاع مہر شب تار کی تلاش میں ہے
کہ میری جیت مری ہار کی تلاش میں ہے

بس ایک بوند برس کر نہال کر جائے
زمین ابر گہر بار کی تلاش میں ہے

ہمارے دل کی اطاعت گزار تنہائی
ہماری جرات ایثار کی تلاش میں ہے

برہنگی کو بہت جستجو لباس کی تھی
امام جبہ و دستار کی تلاش میں ہے

قدم قدم پہ یہ تعمیر مسجد و منبر
خدا بھی کیا در و دیوار کی تلاش میں ہے

چمک رہا ہے فلک پر جو آخری تارا
نہ جانے اب سے عزادار کی تلاش میں ہے

پسند حلقہ احباب ہے مگر محسن
ترا سخن ابھی معیار کی تلاش میں ہے

# منصور عاقل

☆

ہر ذہن شل ہے، طاقتِ گویائی بھی نہیں
منظر گزیدہ آنکھ میں بینائی بھی نہیں

نقشہ بدل گیا ہے کچھ اس طرح دہر کا
جیسے کہ اس جہاں سے شناسائی بھی نہیں

چشمِ جنوں ہے مرگِ حمیت پہ اشکبار
اور دیدۂ خرد میں نمی آئی بھی نہیں

ابلیس محوِ رقص ہے یزداں خموش ہے
آنی تھی غیب سے جو ندا آئی بھی نہیں

اب وہ قلم کہاں کہ لکھے حرفِ خونچکاں
گیرائی کیا ہو فکر میں گہرائی بھی نہیں

اک شوقِ سجدہ ہے سو ہے وہ بھی گراں انہیں
یعنی جبیں کو اذنِ جبیں سائی بھی نہیں

آتش دہانِ مدرسہ و خانقاہ میں
خاکسترِ بصیرت و دانائی بھی نہیں

عاقلؔ سزائے جرمِ ضعیفی کے باوجود
پس ماندگاں کو فکرِ توانائی بھی نہیں

☆

یوں جلتا ہوا گھر ہے کہ دیکھا نہیں جاتا
وہ سامنے منظر ہے کہ دیکھا نہیں جاتا

تحقیر سی تحقیر ہے تذلیل سی تذلیل
اس طرح نگوں سر ہے کہ دیکھا نہیں جاتا

اب اور تو کیا ہو گی قیامت کہ یہ دنیا
وہ عرصۂ محشر ہے کہ دیکھا نہیں جاتا

شکوہ فلکِ پیر سے کیا ہو کہ زمیں بھی
اس درجہ ستمگر ہے کہ دیکھا نہیں جاتا

انساں ہیں کہ پتھر یہ سمجھ میں نہیں آتا
وہ شیوۂ آذر ہے کہ دیکھا نہیں جاتا

اک شورشِ پیہم کے سبب صورتِ حالات
اس درجہ مکدّر ہے کہ دیکھا نہیں جاتا

خُمِ خانۂ ایّام لہو رنگ ہے یارو
گردش میں وہ ساغر ہے کہ دیکھا نہیں جاتا

ہر شخص سراسیمۂ حالات ہے عاقلؔ
اک درد کا پیکر ہے کہ دیکھا نہیں جاتا

## پروفیسر خیال آفاقی

☆

یہ کیا ہے سوئے طور سے آتی ہے صدا اور
آواز گہہ روح میں پاتا ہوں فضا اور

صحرا پہ تو مجنوں نے کیا اپنا تسلط
رکھتا ہوں میں اب اپنے لئے گھر کی بنا اور

پھر بھیج دیا جاؤں کسی اور جہاں میں
اے کاش کہ ہو جائے کوئی مجھ سے خطا اور

کیا کم تھا جگر پاش سحر خیز نظارا
شام آئی جسے دیکھ کے دل ڈوب گیا اور

جو دیدہ نم مثل شرر کھلتی ہے شب کو
دیتا ہے اسے شہپر جبریل ہوا اور

جنیا بھی ترے عشق میں دنیا سے الگ ہے
مرنے کی بھی اس رنگ میں ہوتی ہے ادا اور

اس گوہر یکتا پہ تو یکتائی بھی قرباں
پیدا نہ ہوا مثل صدف غار حرا اور

وہ صورت معنی جو مرے فکر میں گم ہے
پہنا دی اسے عقل نے لفظوں کی قبا اور

کیوں میری نوا داد کی طالب ہو کسی سے
ہے کارجنوں اور' خیال اس کا صلہ اور

## حسن زیدی

☆

ناامیدیوں نے دی درد کی ہوا برسوں
ضو فشاں رہا پھر بھی عشق کا دیا برسوں

ڈھونڈتے رہے تجھ کو تو نہ مل سکا برسوں
غم ترے نہ ملنے کا کس قدر رہا برسوں

یاس و غم رفیق اپنے خون دل پیا برسوں
تلخی محبت کا تجربہ کیا برسوں

پاس آکے دیکھا تو شام کا وہ سایہ تھا
چشم شوق نے جسکو' قد ترا کہا برسوں

ہجر کے اندھیروں میں آنسوؤں کی قندیلیں
جگمگائیں اور دیکھا راستا ترا برسوں

آنکھ کے دریچوں سے جھانکتے کبھی دل میں
چاند بادلوں کی اوٹ میں چھپا رہا برسوں

کٹ گئی خرابوں میں زندگی حسنؔ اپنی
جن سے شہر بستے تھے وہ رہے جدا برسوں

## سرور انبالوی

☆

اِس کو خبر نہیں کہ یہ آیا ہے کس لئے
حیراں ہوں پھر یہ آدمی زندہ ہے کس لئے

وہ جس گلی کو چھوڑ کے مدت سے چل دیا
وا اس کی سمت دل کا دریچہ ہے کس لئے

ٹھہرا ہے جبکہ ان کا مقدر ہی ٹوٹنا
آخر کھلونے پھر وہ بناتا ہے کس لئے

جب تتلیوں سے نور بصارت ہی چھن گیا
صحرا میں پھر گلاب یہ کھلتا ہے کس لئے

سائے سے آدمی کے گریزاں ہے آدمی
پھر آدمی پہ آدمی مرتا ہے کس لئے

جانباز سر ہتھیلی پہ رکھے ہوئے بھی تھے
لشکر مقامِ فتح سے لوٹا ہے کس لئے

سچ بات کی شنید کا جب حوصلہ نہیں
احساس کی رگوں کو جھنجوڑا ہے کس لئے

خائف ہے جب وہ تند ہواؤں سے ہی سرور
پھر بام پر چراغ جلاتا ہے کس لئے

## سلطان صبروانی

☆

خود سے ہم کچھ سوال کیا کرتے
طے یہ کار محال کیا کرتے

ہم اندھیروں سے ہو گئے مانوس
روشنی کا خیال کیا کرتے

اس کی مرضی پہ مطمئن ہیں ہم
رنج کیسا --- ملال کیا کرتے

خامشی بھی ہے اب تو رسوائی
پر کسی سے سوال کیا کرتے

دوستوں سے چھپا لیا چہرہ
اِن سے ہم عرضِ حال کیا کرتے

صبح اس کی ہے شام بھی اُس کی
یہ عروج و زوال کیا کرتے

دِل شکستہ ہوا ' عزیز ہوا
اور ہم دیکھ بھال کیا کرتے

درد بھی صبؔر بھی عطا اُس کی
زخم کا اندمال کیا کرتے

## پروفیسر زہیر کنجاہی

☆

ہماری گفتگو ہر سو ہماری داستاں ہر سو
کہاں سے آگئے ہیں یہ ہمارے راز داں ہر سو

زمیں پر رنگ و بو ہر سو' فلک پر کہکشاں ہر سو
نمایاں ہیں کسی کے حسن مخفی کے نشاں ہر سو

صدا دینے لگے ہیں ماہ و انجم صورت غنچہ
نظر آنے لگا ہے ان کا اعجاز بیاں ہر سو

کہیں آلام کے طوفاں کہیں غم کے تھپیڑے ہیں
محبت لے رہی ہے زندگی کا امتحاں ہر سو

ہمارے ذوق سجدہ نے کہاں پہنچا دیا ہم کو
جدھر دیکھا نظر آیا تمہارا آستاں ہر سو

زہیر خستہ جاں کو کون پوچھے گا زمانے میں
بظاہر ڈھونڈتی ہے اس کو چشم دوستاں ہر سو

## نورالزماں احمد اوج

☆

تم نے دیکھا نہ کبھی چشم ترحم سے مجھے
یہ بہرحال شکایت ہی رہی تم سے مجھے

میرے ہمراہ مرے بخت کی تاریکی ہے
دور ہی رہنے دو بزم مہ وانجم سے مجھے

یاس و امید کی لہریں ہیں کہ تھمتی ہی نہیں
کیسے چھٹکارا ملے فکر کے قلزم سے مجھے

عہد و پیمان وفا کی تو حقیقت کیا تھی
اس نے مسحور کیا حسن تکلم سے مجھے

میری خوشیاں تھی بہرحال تمہیں سے موسوم
تم نے کیوں کردیا محروم تبسم سے مجھے

شاعری اوجِ ثریا پہ پہنچ جائے مری
میرے اشعار سنا دو جو ترنم سے مجھے

## سید حبیب اللہ اوجؔ

☆

چاند آئے گا اتر کر مرے گھر آج کی رات!
ہوگا مہماں مرا وہ رشکِ قمر آج کی رات!

کہہ دو زاہد سے کہ 'معراج اسے کہتے ہیں!
رکھا ہوگا مرے زانو پہ وہ سر آج کی رات

امتیازِ من و تو کچھ نہ رہے گا ہم میں
ایسے ہو جائیں گے ہم شیر و شکر آج کی رات

کھول دے اپنے خزانوں کو اجازت ہے' فلک!
جتنا جی چاہے لٹا لعل و گہر آج کی رات!

آج تک جتنی جفاؤں نے نمک پاشی کی!
ان کو دکھلاؤں گا وہ زخمِ جگر آج کی رات

کون جانے کہ غریب اوجؔ پہ کیا گزرے گی
حسبِ امید وہ آئیں نہ اگر آج کی رات

## حکیم سرو سہارنپوری

☆

جہاں کی رعنائیوں میں کل بھی اگرچہ کوئی کمی نہیں تھی
مگر جو تیرے بغیر گزری وہ زندگی زندگی نہیں تھی

نہ کوئی طوفان آرزو تھا نہ کوئی سیلاب رنگ و بو تھا
ہمارے حسنِ نظر سے پہلے تو حسن کی بات ہی نہیں تھی

ہمارے دم سے قدم قدم پر چراغ روشن ہیں حسرتوں کے
وگرنہ راہِ وفا میں پہلے کہیں کوئی روشنی نہیں تھی

ہماری گمراہیوں کا الزام کس پہ آتا بجز ہمارے
کہ راہبر بھی نئے نہیں تھے یہ راہ بھی اجنبی نہیں تھی

کچھ ایسے چہرے بھی ساتھ اپنے حدودِ دار و رسن تک آئے
کہ منزلِ زندگی کی جن کو سرے سے پہچان ہی نہیں تھی

وہی جو پلکوں پہ آکے کانپی تھی اپنی اک ان کہی تمنا
وہاں فسانوں میں ڈھل گئی ہے یہاں کوئی بات ہی نہیں تھی

## حکیم سرو سہارنپوری

# تاجدار غزل

(بیاد حضرت جگر مرادآبادی مرحوم)

جگر نشان غزل ہے جگر وقار غزل
کہ جس کے دم سے فروزاں ہے رہ گزار غزل

مزاج حسن کا آئینہ بات بات تری
کہ حرف حرف غزل تیرا تاجدار غزل

بجا ہے تجھ کو جو کہیئے رسول کشور حسن
کہ تجھ پہ اتری ہیں آیات مشک بار غزل

یہ سب کا سب تری مشاطگی کا صدقہ ہے
مہک رہے ہیں جو گیسوئے تابدار غزل

تری صدا نے ابھارے خطوط حسن و جمال
تجھے پڑھا ہے تو آیا ہے اعتبار غزل

تو وہ نگاہ محبت کہ بے نقاب ہوا
ترے حضور میں محبوب پردہ دار غزل

ترے نقوش قدم منزل ہنر کے سراغ
تری غزل کہ حقیقت میں ہے عیار غزل

جلے ہیں ایسے ترے سوز آرزو کے دیئے
چراغ طور ہوئی محفل نگار غزل

ترے قدم بہ قدم ہے سحاب نکہت و رنگ
ترے جلو میں رواں لشکر بہار غزل

وجود لفظ و بیاں میں سمو دئے ہیں وہ رنگ
کہ آج ملک سخن میں ہے اقتدار غزل

یہ ربط شعلہ و شبنم ! یہ وصل نور و نظر
غزل نثار جگر ہے جگر نثار غزل

ترے مقام مرے ذوق کا تقاضا ہے
غزل کے رنگ میں ہو مدح شہر یار غزل

مرے لئے تو یہ معراج افتخار ہے سرو
کہ آج میں بھی ہوں وابستۂ بہار غزل

## سید حبیب اللہ اوجؔ

☆

چاند آئے گا اتر کر مرے گھر آج کی رات!
ہو گا مہماں مرا وہ رشک قمر آج کی رات!

کہہ دو زاہد سے کہ معراج اسے کہتے ہیں!
رکھا ہو گا مرے زانو پہ وہ سر آج کی رات

امتیاز من و تو کچھ نہ رہے گا ہم میں
ایسے ہو جائیں گے ہم شیر و شکر آج کی رات

کھول دے اپنے خزانوں کو اجازت ہے فلک!
جتنا جی چاہے لٹا لعل و گہر آج کی رات!

آج تک جتنی جفاؤں نے نمک پاشی کی!
ان کو دکھلاؤں گا وہ زخم جگر آج کی رات

کون جانے کہ غریب اوجؔ پہ کیا گزرے گی
حسب امید وہ آئیں نہ اگر آج کی رات

## حکیم سرو سہارنپوری

☆

جہاں کی رعنائیوں میں کل بھی اگرچہ کوئی کمی نہیں تھی
مگر جو تیرے بغیر گزری وہ زندگی زندگی نہیں تھی

نہ کوئی طوفان آرزو تھا نہ کوئی سیلاب رنگ و بو تھا
ہمارے حسن نظر سے پہلے تو حسن کی بات ہی نہیں تھی

ہمارے دم سے قدم قدم پر چراغ روشن ہیں حسرتوں کے
وگرنہ راہ وفا میں پہلے کہیں کوئی روشنی نہیں تھی

ہماری گمراہیوں کا الزام کس پہ آتا بجز ہمارے
کہ راہبر بھی نئے نہیں تھے یہ راہ بھی اجنبی نہیں تھی

کچھ ایسے چہرے بھی ساتھ اپنے حدود دار و رسن تک آئے
کہ منزل زندگی کی جن کو سرے سے پہچان ہی نہیں تھی

وہی جو پلکوں پہ آ کے کانپی تھی اپنی اک ان کہی تمنا
وہاں فسانوں میں ڈھل گئی ہے یہاں کوئی بات ہی نہیں تھی

## سلطان صبروانی

☆

خزاں کا روپ لئے موسم بہار میں ہیں
لٹے ہوئے کسی چہرے کے اعتبار میں ہیں

حروف بکھرے ہوئے ہیں سماعتیں موقوف
طلوعِ صبح غزل ہی کے انتظار میں ہیں

وہ کیسی صبح تھی جب ہم سفر پہ نکلے تھے
سو آج شامِ تمنا کے مرگ زار میں ہیں

ہمارے عشق نے زنجیر ہم کو پہنائی
یہ واقعہ ہے کہ ہم حسن کے حصار میں ہیں

سمجھ میں آ نہیں سکتے ہمارے نقش و نگار
کہ سنگ میں ہیں کبھی ہم کبھی شرار میں ہیں

کہاں سے لائیں نئے عہد کی نئی تعبیر
گرفتِ خواب میں ہیں اور اسی خمار میں ہیں

## محمود رحیم

☆

مری گرفت میں تھے، میری دسترس میں رہے
تمام پردہ نشینانِ شہر بس میں رہے

رفاقتوں کے برس لمحوں کے لباس میں تھے
مگر جدائی کے پل پل برس برس میں رہے

شگفتِ رنگ کسی کُنجِ گُل میں خوابیدہ
بہارِ صوت کسی حجلۂ جرس میں رہے

وہ بازی جیت گئے، تھے جو صاحبانِ جنوں
جنہیں شعور کا دعویٰ تھا، پیش و پس میں رہے

ترے حوالے سے ہر گفتگو کروں آغاز
کہ تیرے نام کی خوشبو نفس نفس میں رہے

خزاں رہی تو بہاروں کی آس رہتی تھی
بہار آئی تو پابندیِ قفس میں رہے

حمایت علی شاعر

# تمہارے بعد☆

آج میں سو سکا نہ ساری رات
آج تم رات بھر تھیں میرے پاس
تم مجھے دیکھتی تھیں، میں تم کو
ہم نے آپس میں کی نہ کوئی بات
دل میں جو کچھ تھا ہم پہ روشن تھا
کس قدر تھے عجیب وہ لمحات

-----

ایک اک لمحہ بیتے جیون کا
آ کے بیٹھا ہوا تھا اپنے پاس
سارا ماضی تھا اپنی آنکھوں میں
زندگی آگئی تھی کتنی راس
کس قدر مطمئن تھے ہم دونوں
ایک لمحہ بھی ہم رہے نہ اداس

-----

خامشی گفتگو سراپا تھی
دل کی دھڑکن میں ساز بجتے رہے
دور بجتی رہی تھی شہنائی
آنکھوں آنکھوں میں خواب سجتے رہے
روح میں ہو رہی تھی بارش سی
اور بادل کہیں گرجتے رہے

-----

کس کو ایسی وفا ملی ہو گی
کون خوش بخت اس قدر ہو گا
کس کو معلوم تھا، اجڑ کے بھی
اتنا آباد اپنا گھر ہو گا
ساتھ چھوٹا نہیں بچھڑ کے بھی
کس کا پیار اتنا معتبر ہو گا

-----

تم تو جا ہی چکی ہو دنیا سے
میں بھی کچھ دن میں آنے والا ہوں
مجھ پہ جو کچھ گزر رہی ہے یہاں
تم کو سب کچھ سنانے والا ہوں
زندگی کو تو آزما ہی چکا
موت کو آزمانے والا ہوں

---

☆ جناب حمایت علی شاعر کی اہلیہ کی ناگہانی رحلت کو مہینے گزر گئے ہیں لیکن قارئین نظم سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ شاعر کے دل و دماغ پر لگنے والے زخم کتنے گہرے ہیں اللہ انہیں صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین (ادارہ)

حکیم سرو سہارنپوری

# تاجدار غزل

(بیاد حضرت جگر مرادآبادی مرحوم)

جگر نشان غزل ہے جگر وقار غزل
کہ جس کے دم سے فروزاں ہے رہ گزار غزل

مزاج حسن کا آئینہ بات بات تری
کہ حرف حرف غزل تیرا تاجدار غزل

بجا ہے تجھ کو جو کہیئے رسول کشور حسن
کہ تجھ پہ اتری ہیں آیات مشک بار غزل

یہ سب کا سب تری مشاطگی کا صدقہ ہے
مہک رہے ہیں جو گیسوئے تابدار غزل

تری صدا نے ابھارے خطوط حسن و جمال
تجھے پڑھا ہے تو آیا ہے اعتبار غزل

تو وہ نگاہ محبت کہ بے نقاب ہوا
ترے حضور میں محبوب پردہ دار غزل

ترے نقوش قدم منزل ہنر کے سراغ
تری غزل کہ حقیقت میں ہے عیار غزل

جلے ہیں ایسے ترے سوز آرزو کے دیئے
چراغ طور ہوئی محفل نگار غزل

ترے قدم بہ قدم ہے سحاب نکہت و رنگ
ترے جلو میں رواں لشکر بہار غزل

وجود لفظ و بیاں میں سمو دئے ہیں وہ رنگ
کہ آج ملک سخن میں ہے اقتدار غزل

یہ ربط شعلہ و شبنم! یہ وصل نور و نظر
غزل نثار جگر ہے جگر نثار غزل

ترے مقام مرے ذوق کا تقاضا ہے
غزل کے رنگ میں ہو مدح شہر یار غزل

مرے لئے تو یہ معراج افتخار ہے سرو
کہ آج میں بھی ہوں وابستۂ بہار غزل

## شاہد واسطی

# میں بھی ہوں

بسا اوقات ہم دیوار و در میں بھی بہت آزاد ہوتے ہیں
کسی انسان کی موجودگی بھی کچھ نہیں کہتی
فقط اک لمحہ تخلیق کو قابو میں کرتے ہیں
اگر قرطاس پر تصویر بن جائے
وہ لہریں قید ہو جائیں
کہ جو اندر بڑی ہلچل مچاتی ہیں
تو پھر ہم شکر کرتے ہیں
کہ ہم نے اک تقاضے کو
کوئی پوشاک پہنا دی
ذرا سی دیر میں کوئی تخیل کی نئی کونپل
کہیں سے جھانکتی ہے اور کہتی ہے
کہ میں بھی ہوں

## ظفر علی راجا

# اور مٹی کا آدمی

میں اور مٹی کا آدمی ہوں
بکھر بھی جاؤں
تو میری ہستی کا کوئی ذرّہ
فنا کی اندھی گپھا میں گرتے
تمام ذرّے سمیٹ لائے
شکستگی کے نشاں مٹائے
نئے سرے سے مجھے بنائے
ابد کا دست قضا بھی مجھ میں
نمود نو کا پیام پائے
مرے عدو
یہ خیال رکھنا
مجھے مٹانا نہیں ہے ممکن
جدا ہے فطرت میں خاک میری
میں اور مٹی کا آدمی ہوں

کتاب : ارمغان خاکی

مصنف : عزیزالدین خاکی

مرتب : شہزاد احمد

ناشر : انجمن ترقی نعت (ٹرسٹ) پاکستان۔کراچی

ضخامت: ١٢٠ صفحات قیمت: ٤٠ روپے

زیرنظر مجموعہ نعت عزیزالدین خاکی کی کاوش فکر اور حب رسولؐ کا مظہر ہے جسے ان کے اسی عشق و جذبہ سے سرشار ایک رفیق کار نے ترتیب و تدوین سے نواز ہے۔اس مجموعہ کی تمام نعتیں نہایت سلیس اور سادہ ہیں۔نعت گوئی صنف شاعری میں نازک ترین فن ہے۔جس میں عشق و سرمستی کے ساتھ ساتھ حد ادب کے جملہ تقاضے بھی پیش نظر رکھنے ہوتے ہیں۔اس باب میں کسی غفلت یا لفظ و بیاں کی ذرا سی لغزش بھی قابل معافی نہیں۔ جو اس راہ عشق سے سرخروئی سے گزر گیا' اس کی سعادت کے کیا کہنے۔اللہ تعالیٰ نے عزیز الدین خاکی کو جن سعادتوں سے نوازا ہے ان میں ایک نعت خوانی کا اور دوسرا نعت گوئی ہے۔نعت محض شاعری کا نام نہیں ہے۔اس لئے کہ جس کی تعریف خود خالق کون و مکاں کرے 'بندہ اس محبوب خدا کی تعریف میں کہاں تک جا سکتا ہے۔اس سلسلہ میں سید رفیق عزیزی فرماتے ہیں کہ نعت گوئی جس قدر مقدس فریضہ ہے۔ اسی قدر مشکل اور نازک کار شیشہ گری بھی ہے۔عزیزالدین خاکی پر قدرت بہت مہربان ہے۔آپ وہ خوش فکر و خوش قسمت انسان ہیں۔جنہوں نے اپنے قلم کو مدحت رسولؐ کے لئے وقف کر دیا ہے۔آپ کے حمد و نعت پر مشتمل کئی مجموعے۔جن میں ذکر خیر الوریٰؐ ذکر صلی علیٰ' نغمات طیبات' نورالھدیٰ' فخر کون و مکاں وغیرہ منظر عام پر آکر پاک و ہند کے اہل علم و دانش سے قبول عام کی سند حاصل کر چکے ہیں۔

'ارمغان خاکی' فروغ نعت کے سلسلہ کی ایک اہم کڑی اور 'نعتیہ ادب' میں ایک قابل قدر اور بیش بہا اضافہ ہے بلکہ آپ کی ہر کاوش باعث سعادت دارین ہے۔

شاہد واسطی

# میں بھی ہوں

بسا اوقات ہم دیوار و در میں بھی بہت آزاد ہوتے ہیں
کسی انسان کی موجودگی بھی کچھ نہیں کہتی
فقط اک لمحہ تخلیق کو قابو میں کرتے ہیں
اگر قرطاس پر تصویر بن جائے
وہ لہریں قید ہو جائیں
کہ جو اندر بڑی ہلچل مچاتی ہیں
تو پھر ہم شکر کرتے ہیں
کہ ہم نے اک تقاضے کو
کوئی پوشاک پہنا دی
ذرا سی دیر میں کوئی تخیل کی نئی کونپل
کہیں سے جھانکتی ہے اور کہتی ہے
کہ میں بھی ہوں

ظفر علی راجا

# اور مٹی کا آدمی

میں اور مٹی کا آدمی ہوں
بکھر بھی جاؤں
تو میری ہستی کا کوئی ذرّہ
فنا کی اندھی گپھا میں گرتے
تمام ذرّے سمیٹ لائے
شکستگی کے نشاں مٹائے
نئے سرے سے مجھے بنائے
ابد کا دست قضا بھی مجھ میں
نمودِ نو کا پیام پائے
مرے عدو
یہ خیال رکھنا
مجھے مٹانا نہیں ہے ممکن
جدا ہے فطرت میں خاک میری
میں اور مٹی کا آدمی ہوں

محمود اختر سعید

# نقد ونظر

کتاب : شمیم روشؔ۔ شخصیت اور فن

مرتّب : ڈاکٹر وفا راشدی

ناشر : دائرہ علم وادب پاکستان۔ کراچی

ضخامت : ۲۸۱ صفحات قیمت: ۲۰۰ روپے

زیر نظر کتاب، ایک جواں سال شاعر محمد شمیم احمد خاں روشؔ کی شخصیت اور فن کے بارے میں، ان کے احباب اور ارباب نقد ونظر نے اخبارات ورسائل میں جو کچھ لکھا، ان تمام تبصروں اور مضامین کو ڈاکٹر وفا راشدیؔ صاحب نے صحرائے ادب میں بکھرے ہوئے ان نگینوں کو چھان پھٹک کر قارئین علم وادب کے لئے محفوظ کردیا ہے۔ جس شاعر کے بارے میں جگن ناتھ آزاد، راغب مراد آبادی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، قتیل شفائی ،شبنم رومانی اور وزیری پانی پتی جیسے ارباب فکر ونظر نے اظہار خیال کیا ہو،ان کی قادرالکلامی میں کیا کلام ہوگا۔ ان تمام اہل قلم حضرات نے شمیم روش کے کلام کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے انہیں دل کھول کر داد دی ہے۔ گو ادبی حلقوں میں اس ابھرتے ہوئے شاعر کا نام کوئی اتنا معروف اور نمایاں نہیں تھا۔ لیکن جس غیر معروف شاعر اور اس کے کلام کو ڈاکٹر وفا راشدی جیسے مقتدر محقق اور نقاد نے لائق توجہ جانا۔ یہ بات شمیم روش کے لئے حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ باعث اعزاز وفضیلت ہے۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر وفا راشدی کا توجہ فرمانا اس حقیقت کا اعتراف بھی ہے کہ شمیم روش بجا طور پر اس اعزاز کے مستحق بھی ہیں کہ ان کے فکر ونظر اور انداز سخن گوئی کی رفعتوں کو سمجھا اور پرکھا جائے۔ راشدی صاحب نے کتاب کے شروع میں ایک نہایت معلوماتی مقالہ نما خاکہ شمیم روش کے حالات زندگی اور کلام کے بارے میں تحریر کیا ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ شمیم روش غم زندگی کے نشیب وفراز سے کس طرح دیوانہ وار گزر رہے ہیں۔ وہ زندگی کی داخلی وخارجی کیفیتوں سے کیونکر آشنا ہوئے، اور فکر واحساس کے دیئے جلانے کے لئے انہوں نے تلخ وشیریں تجربات ومشاہدات کو کس سلیقے سے سپرد قلم کیا ہے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں۔ برسوں تن شاعر میں لہو خشک ہوتا ہے تو کہیں جاکر کلام میں گہرائی وگیرائی اور تاثیر

پیدا ہوتی ہے۔ بہر حال ہم بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر وفا راشدی نے اس کتاب کو مرتب و شائع کر کے اپنی ادبی نیکیوں کے باب میں مزید قابل قدر اضافہ کیا ہے۔

---

کتاب : صحرا میں چاند

مرتّب : سرور انبالوی

ناشر : مکتبہ گلزار ادب۔ راولپنڈی

ضخامت : ۱۹۲ صفحات قیمت ۴۰ روپے

زیر نظر کتاب وہ 'سبد گل' ہے جس میں معروف اور نئے شعراء کے انتخاب کلام کو مختصر سوانحی خاکوں کے ساتھ یک جا کر دیا گیا ہے۔ کتاب کے نام سے بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ گزشتہ زمانے کا تحریر کیا ہوا کوئی اسلامی رومانوی ناول ہے۔ جس کا نیا پرنٹ چھپ کر مارکیٹ میں آیا ہے۔ فاضل مرتب سرور انبالوی صاحب طویل عرصہ سے اپنے دولت کدہ پر علم و ادب کی محفلیں آراستہ کر کے شمع علم کو روشن کیے ہوئے ہیں۔ ان محفلوں میں معروف و غیر معروف شاعر اور ادیب کسی تخصیص کے بغیر اپنے حصہ کی توانائی نذر کر کے ان چراغوں کی لو بڑھاتے رہتے ہیں۔ یہ علمی و ادبی کار خیر تادم تحریر جاری و ساری ہے۔ ان ہفتہ وار اور ماہانہ ادبی محفلوں کا ایک نہایت حسین اور افادیت سے بھرپور پہلو یہ ہے کہ ان ادبی محفلوں کی روداد اور ان کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے طرحی اور غیر طرحی مشاعروں اور ادبی نشستوں کو کتابی صورت میں شائع کیا جاتا ہے' یہ روداد یں' کچھ عرصہ گزرنے کے بعد حوالہ و تحقیق کی مستند دستاویزات کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں۔ جن سے محققین کو اس عہد پر کام کرنے میں کافی سہولت میسر آتی ہے۔ یوں ذوق و شوق سے لگایا ہوا یہ پودا کچھ عرصہ بعد نہایت مفید و شیریں برگ و بار سے آراستہ و پیراستہ ہو جاتا ہے۔ زیر نظر مجموعہ میں سترہ شعراء کا چیدہ چیدہ کلام یک جا کر کے فاضل مرتب نے یوں کہیے کہ چراغ جلا کر سر بام رکھ دیے ہیں۔ ان کی روشنی میں محقق اپنے اپنے ادبی منظر ناموں کے سنگ میل کا درست تعین کر سکتے ہیں۔ بقول مرتب آپ ۱۹۷۹ء میں 'ایوان غزل' کے نام سے اسی قسم کا ایک شعری مجموعہ ترتیب دے کر شائع کر چکے ہیں۔ آپ کی یہ دوسری کاوش' صحرا کا چاند' ہی علمی و ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔ ہر چند یہ مختصر مجموعہ 'بہ قامت کہتر' ہے۔ مگر اہل نقد و نظر کے نزدیک بر بنائے افادیت 'بہ قیمت بہتر' کے مصداق ہے۔

کتاب : ارمغان خاکی

مصنف : عزیز الدین خاکی

مرتب : شہزاد احمد

ناشر : انجمن ترقی نعت (ٹرسٹ) پاکستان۔ کراچی

ضخامت : ۱۲۰ صفحات قیمت : ۴۰ روپے

زیرنظر مجموعہ نعت عزیز الدین خاکی کی کاوش فکر اور حب رسول ؐ کا مظہر ہے جسے ان کے اسی عشق و جذبہ سے سرشار ایک رفیق کار نے ترتیب و تدوین سے نواز ہے۔ اس مجموعہ کی تمام نعتیں نہایت سلیس اور سادہ ہیں۔ نعت گوئی صنف شاعری میں نازک ترین فن ہے۔ جس میں عشق و سرمستی کے ساتھ ساتھ حد ادب کے جملہ تقاضے بھی پیش نظر رکھنے ہوتے ہیں۔ اس باب میں کسی غفلت یا لفظ و بیاں کی ذرا سی لغزش بھی قابل معافی نہیں۔ جو اس راہ عشق سے سرخروئی سے گزر گیا' اس کی سعادت کے کیا کہنے۔ اللہ تعالیٰ نے عزیز الدین خاکی کو جن سعادتوں سے نوازا ہے ان میں ایک نعت خوانی کا اور دوسرا نعت گوئی ہے۔ نعت محض شاعری کا نام نہیں ہے۔ اس لئے کہ جس کی تعریف خود خالق کون و مکاں کرے' بندہ اس محبوب خدا کی تعریف میں کہاں تک جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں سید رفیق عزیزی فرماتے ہیں کہ نعت گوئی جس قدر مقدس فریضہ ہے۔ اسی قدر مشکل اور نازک کار شیشہ گری بھی ہے۔ عزیز الدین خاکی پر قدرت بہت مہربان ہے۔ آپ وہ خوش فکر و خوش قسمت انسان ہیں۔ جنہوں نے اپنے قلم کو مدحت رسول ؐ کے لئے وقف کر دیا ہے۔ آپ کے حمد و نعت پر مشتمل کئی مجموعے۔ جن میں ذکر خیر الوریٰ ؐ ذکر صلی علیٰ' نغمات طیبات' نور الہدیٰ' فخر کون و مکاں وغیرہ منظر عام پر آ کر پاک و ہند کے اہل علم و دانش سے قبول عام کی سند حاصل کر چکے ہیں۔

'ارمغان خاکی' فروغ نعت کے سلسلہ کی ایک اہم کڑی اور 'نعتیہ ادب' میں ایک قابل قدر اور بیش بہا اضافہ ہے بلکہ آپ کی ہر کاوش باعث سعادت دارین ہے۔

کتاب : سسکیاں سنائی دیں

شاعر : احمد مسعود

ناشر : دارالاشاعت بزم علم وفن پاکستان

ضخامت : ۱۲۸صفحات قیمت:۳۰۰روپے/دس پونڈ

زیرِنظر کتاب 'وطن سے دور' ملک وملت کے دکھ درد سے آشنا جناب احمد مسعود کا اولین مجموعہ کلام ہے۔اس مجموعہ میں تقریباً ۶۰ عدد غزلیں اور چند قطعات ہیں۔ابتدا حسب دستور از راہ خیر و برکت نعت حضور نبی کریمؐ سے ہوتی ہے۔زیرِنظر مجموعہ کو دیکھ کر ایک خوشگوار سا احساس ہوتا ہے کہ موصوف نے علمی وادبی مراکز سے دور رہتے ہوئے بھی روح غزل کو غیر مانوس تراکیب و الفاظ سے مجروح نہیں ہونے دیا۔روایت کی پاسداری کرتے ہوئے اپنی انفرادیت بھی قائم رکھی ہے۔آپ اپنے گردوپیش کے حالات وواقعات کو اپنی فکر سخن کا موضوع بناتے ہیں۔ ان کے اندر کا حساس شاعر معاشرے اور سماج میں پھیلی ہوئی زبوں حالی اور انسانی قدروں کی پامالی پر مضطرب دکھائی دیتا ہے۔ان کے ہاں ہمیں عصری شعور' ایک وسیع وژن کے ساتھ ملتا ہے۔جس سے کلام میں تازگی اور نکھار کا خوشگوار احساس ہوتا ہے ویسے بھی غزل کا کینوس ایسا تنگ داماں ہرگز نہیں' جہاں احساس کا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو۔غزل کے کینوس پر قدیم وجدید بلکہ ہر عہد کے مضامین نو بہ نو کی رنگ آمیزی عجب بہار دکھاتی ہے۔ہمیں احمد مسعود کے ہاں سلاست زبان' سادگی اور روایت کی پاسداری کو محسوس کرتے ہوئے حیرت ہوتی ہے اور کسی جگہ بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ آپ سات سمندر پار بیٹھے ہوئے ایک قطعی اجنبی ماحول میں فکرِ سخن میں محو ہیں۔یہی وجہ ہے جو آپ نے اکبر حیدر آبادی' محمود ہاشمی' محسن احسان اور اعزاز احمد آذر جیسے ہم عصروں سے ''سخن شستہ کا شائستہ شاعر'' کہلانے کا اعزاز پایا ہے۔اور سب سے بڑھ کر محترم شوکت واسطی کا انہیں ان الفاظ میں خراج تحسین کہ ''متوازن نظریئے رویے کے اس سخن طراز کی شاعرانہ اور فنکارانہ ادا مجھے اچھی لگی ہے۔'' ان الفاظ کے بعد کسی اور کے کچھ کہنے کی گنجائش کہاں باقی رہتی ہے۔احمد مسعود کا یہ مجموعہ کلام جسے بزم علم وفن پاکستان نے نہایت عمدہ گیٹ اپ کے ساتھ شائع کیا ہے' ہمارے شعری ادب میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔

کتاب : درد کی نیلی رگیں

شاعرہ : فرزانہ خاں نیناں

ناشر : دارالاشاعت بزم علم وفن پاکستان

ضخامت : ۱۸۹ صفحات قیمت: ۳۰۰ روپے/پانچ پونڈ

قابل صد افتخار و ستائش ہیں وہ لوگ جو دیار غیر میں رہتے ہوئے بھی ملک و ملت اور زبان و ادب سے نہ صرف رشتہ استوار کیئے ہوئے ہیں۔ بلکہ دامے، درمے، سخنے زبان و ادب کی آبیاری کیلئے کوشاں بھی رہتے ہیں۔ زیر نظر کتاب نوٹنگھم (برطانیہ) میں مقیم فرزانہ خاں نیناں کا مجموعہ کلام ہے۔ نیناں، ہمارے نسائی ادب میں ایک ابھرتا ہوا نام ہے۔ جن کے کلام کی خوشبو دیار غیر سے ہوتی ہوئی پاک وطن تک پہنچی ہے۔ ان کا انداز سخن گوئی نسوانی اسلوب کی نشاندہی کرتا ہے۔ انہوں نے یورپ کی آزاد فضاؤں میں رہتے ہوئے بھی خالص مشرقی روایات کو ترک نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے ان کا کلام جملہ لطافتوں سے یوں مزین ہے، جیسے چلمن کی اوٹ سے جھانکتے ہوئے کسی حسین پیکر کے خطوط۔ ان کے ہاں تشبیہ و استعارہ میں نیلگوں پہنائیوں میں ہلال عید کی سی دلفریبی ہے، ان کی قوت مشاہدہ سے امید ہے کہ تجربات کی بھٹی سے نکل کر ابھی انہیں ماہ تمام ہونا ہے۔ ان کے ہاں حسین خوابوں اور خیالوں کی کمی نہیں، الفاظ انہیں پریوں کی مانند دکھائی دیتے ہیں۔ تتلیوں کی، پرندوں کی ہم نفس نیناں کو کبھی ہیر بن کر جنگل جنگل بھٹکنا اچھا لگتا ہے، تو کبھی تخلیق کے بے پناہ کرب کے عمل سے نئی زندگی سے ہمکنار ہونا اچھا لگتا ہے۔ ان کے ہاں کہیں دبی خواہشوں کی دھواں دیتی ہوئی جسم کی گیلی لکڑی ہے، تو کہیں دل کے شال پر گل بوٹے بناتی ہوئی مہکتی یادیں ہیں۔ گنگناتی ہوئی شامیں، نیلگوں جھیل میں چاند کے لرزتے ہوئے سائے، دھنک رنگ اڑتے ہوئے آنچل، ہجر و وصال کے تذکرے، شرم و حیا میں بسے الفاظ و تراکیب، گویا وہ سبھی کچھ ہے، جن سے نسائیت عبارت ہے۔ پروفیسر شوکت واسطی، ڈاکٹر طاہر تونسوی اور پروفیسر محسن احسان نے اپنے اپنے طرز پر اس نئے لہجہ کی شاعرہ کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے ان کے درخشاں مستقبل کی پیش گوئی کی ہے۔ جن کے انداز شعر گوئی نے اہل ذوق کو بہت جلد اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔ امید ہے اس خوبصورت اور دیدہ زیب مجموعہ کلام کو خاطر خواہ پذیرائی ملے گی۔

# مراسلات

## پروفیسر شوکت واسطی۔ اسلام آباد

آپ نے اس بار اداریئے میں ادب عالیہ کے حوالے سے دلچسپ اور کارآمد بحث اٹھائی ہے۔ تاہم مجھے محسوس ہوا کہیں کچھ نہ کچھ خلط مبحث ہو رہا ہے۔ ادب عالیہ یا آفاقی ادب کی اصطلاح انگریزی زبان میں کلاسک کی ہم معنی ہے۔ اردو میں اس سے مراد صرف وہ ادب لیں جو خصوصی طور ایسا معتبر ہو جسے وقت یا زمانہ کبھی رد یا فراموش نہ کر سکے' یہ ہر نسل انسانی کی دستبرد سے محفوظ یوں بھی رہ جاتا ہے کہ اس کی بقا کا انحصار کلیۂ تحریری بھی نہیں بلکہ معتد بہ صدری ہے' قلم اس کا سفینہ نہیں' یہ سینہ بہ سینہ سفر میں رہتا ہے۔ حسب معمول اس بار بھی اداریہ بجا طور اقدار کی پاسداری کی تکرار میں ہے اور اصرار ان باتوں پر جن سے دھیان روگرداور رویہ سرد ہے۔ میں اس پر کلی صاد کروں مگر ایزاد کروں کہ ہر ایک ادب بھی ادب عالیہ کے ذیل میں نہیں رکھا جا سکتا۔ زمانہ قدیم کے ادب عالیہ میں سنسکرت کے رامائن اور مہابھارت کو جگہ دی جانی چاہئے زمانہ وسطی میں یہ اعزاز بلاشبہ فردوسی کے شاہ نامہ کو حاصل ہے۔ اس سے پہلے ورجل ڈانٹے کے اینیڈ اور ڈیوائن کامیڈی اس برگزیدہ صنف کے شہکار لکھے جا چکے تھے۔ مابعد ملٹن کی شہرہ آفاق پیراڈائز لاسٹ معرض وجود میں آئی اس کا مکمل اردو منظوم ترجمہ میں نے فردوس گم گشتہ کے عنوان سے کیا تو میرے مرحوم دوست ایوب محسن اور پشاور میں نثر نگاری کے محسن اور میدان تحقیق کے سربرآوردہ شہسوار ظہور اعوان کے پُر زور اصرار پر میں نے ''قلم کا قرض'' قلمبند کی جو تمام تر قرآن مجید کے پس منظر میں حضرت آدم علیہ السلام سے پاکستان کے قیام بلکہ آج تک کی بسیط تاریخ پر محیط ہے۔ یہ ہماری زبان کا اولیں رزمیہ ہے۔ اس بحث پر مزید ڈاکٹر ظہور اعوان کی تحقیقی تالیفات سے استفادہ کریں جنہوں نے دنیا کے پہلے پانچ لاکھ اشعار پر مشتمل وسطی ایشیا کے ایک رزمیہ کی دریافت کا دعویٰ کیا ہے جو اب تک جستہ جستہ سینہ بہ سینہ محفوظ و مامون چلا آتا ہے۔ اس کے بعد یونانی نابینا ہومر کے اوڈیسی اور ایلیڈ کی اولیت کا شرف باطل ٹھہرتا ہے۔ بلا خوف تردید لکھوں کہ اردو میں کسی مکمل تک سک سے ٹھیک ٹھاک رزمیہ کا وجود ناپید سہی' ہماری صنف غزل کو ادب عالیہ کی صف میں وثوق سے رکھا جا سکتا ہے کیونکہ یہ اپنی ہیئت ماہیت' روپ سروپ میں دور بدور بدستور مستند اور معتبر حیثیت سے برقرار اور قائم رہی ہے۔

گو اب اس کا لطف اور پائیدار انداز تغزل اس قدر پامال کیا جا چکا ہے کہ عالی کی بجائے اسے غالی کے خانے میں ڈال دیں کیونکہ ہمارے موجودہ سہل انگار شعر نویسوں نے واقعی اس صنف وحشی کا بہروپ اجاگر کر کے رکھ دیا ہے۔ ان کا افراط تفریط کا عمل ۔۔۔ ناطقہ سر بہ گریباں؟ تاہم غزل کی عالی مرتبی پر کبھی حرف نہ آئے جب تک اس کے گنجینے میں متقدمین ۔ ولی' سودا' میر متوسطین ۔ درد مصحفی آتش ۔ متاخرین ذوق' مومن' غالب کے سے جواہر ریزے موجود ہیں جو بہ ہر اعتبار معتبر اور بہ ہر مد مستند ہیں کہ یہی حقیقی ادب عالیہ کی اصل شان ہے۔ یہ سارا کلام ادب عالیہ کا قابل فخر سرمایہ ہے۔ ہماری غزل میں بھی وہ دلکشی کہاں کہ کوئی اسے جوں کی توں سینے سے لگائے رکھے۔ روایاتی اعتدال کی خُو رہی نہ بنیادی قدروں کی گفتگو۔

اس مرتبہ الاقرباء چند در چند خصوصیات کا مظہر ہے۔ مکتوبات کی بات ہو تو تسلیم کیا جائے انداز خوب سے خوب تر ہوتا جا رہا ہے۔ بے تکلف سوجھ بوجھ ادب آداب کی بات چیت ہونے لگی ہے۔ ہاں البتہ کہیں کہنے کی کوئی بات رہ گئی ہے یا وہ جو کہنے کی خاص نہ تھی کہہ دی گئی ہے۔ پھر بعض لکھی ہوئی تحریریں نادانستہ قطع برید کا شکار ہو گئی ہیں۔ میرا ہی خط لیجئے اس میں ایک پوری سطر کے غائب ہونے سے پورا مضمون غتر بود کا نمونہ بن کر رہ گیا ہے۔ مہربانی کر کے اس کو دوبارہ احتیاط سے لکھا جائے ☆

دو خطوں میں کچھ اعتراض کی بات آئی۔ سعد ایس خان کی تو آپ نے پوری تسلی کر دی اور صحیح کہا کہ انشا کا دور دور تک مزاح سے کوئی لینا نہیں۔ اس میں مجھے اب مزید کچھ کہنا نہیں۔ مگر خان صاحب کی توجہ شمارہ زیر نظر میں مطبوعہ انشائیہ بر ۷۶ صفحہ کی طرف دلاؤں جو اس صنف سخن کا مکمل قابل تقلید شاہپارہ ہے۔ اس انشائیہ کی بھی ہمارے ادب میں بری گت بن چکی ہے اور اس کی ایجاد کے داعی بھی بیشتر نامی گرامی ہیں اور متعدد نے اپنے زور پر اس میں خاصا نام بھی کمایا ہے جس کے وہ اتنے مستحق نہ تھے۔ یہ طرز تحریر پچھلی صدی کی تیسری دہائی میں سانیٹ کے ساتھ ساتھ ہم نے انگریزی سے مستعار لی' سانیٹ میں اختر شیرانی نے کچھ کامیاب کوشش کی مگر اپنی گنی چنی اور نپی تلی ہیئت کے ساتھ یہ چل نہ پایا اور اس کا وہی حشر ہوا جو مغرب میں ڈانٹے کی ترذینی کا ہو چکا تھا۔ البتہ انشائیہ اس وقت کے وقیع ماہنامے ''ہمایوں'' کی شہ پر ادب لطیف کے پیرائے میں کافی عرصے تک جاری رہا۔ انشاء عہد مغلیہ کی ایک سرکاری اصطلاح یوں کر کے تھی کہ محکموں میں جو لوگ نقل نویسی کی خدمات ادا کرتے تھے انہیں منشی بلاتے تھے (یا مرزا)۔ یہ لفظ کبھی تحقیر کا موجب نہیں تھا' خاصا

---

☆ اس سہو کیلئے ادارہ معذرت خواہ ہے

معقول شمار آتا تھا۔ ہمارے ہاں منشی پریم چند تو آخر تک اس کو اپنائے رہے اور اسے کبھی کسر شان نہ مانا۔ بڑے لوگوں کی یہ ادائیں یاد رہنی چاہئیں۔ پھر خدا کا کرنا کیا ہوا کہ انگریز آدھمکے اور ہمارے کئی معتبر عہدوں کی وہ عبرتناک گت بنی کہ رہے نام اللہ کا۔ خان سامان خانساماں ہو گیا' خلیفہ حجام ٹھہرا' وغیرہ۔ منشی صاحب پر یہ کرم ہوا کہ اس بپتا میں چل بسے اور کوئی رسوائی اس لقب کے ساتھ ٹنک نہ سکی۔

اب مختصراً انشائیہ کو سمیٹوں۔ ہاں تو یہ سوفیدانگریزی کے ایسے (Essay) کا چربہ ہے۔ برطانیہ نے اٹھارویں صدی میں ایک سے ایک بڑا مقالہ نگار اس نوع کا پیدا کیا اور ان کی نگارشات ہمارے نصاب انگریزی میں بطور خاص پڑھائی جاتی تھیں۔ ایک ان میں ہیزلٹ کا مضمون تھا جس کے تئیں چلتے ہوئے بات چیت بہت سفلانہ حرکت تھی۔ اس نے (Walking and Talking) واکنگ ٹاکنگ چہل قدمی کے وقت بات چیت رسمی کو رد کیا اور اس کا اظہار دلچسپ ہم آواز لفظوں کو جوڑ کر کیا اور اس وجہ سے یہ آج ساٹھ ستر سال بعد بھی دماغ پر نقش ہے۔ ایسا ہی سبک اور برجستہ انداز بیان انشائیے کی جان اور شان ہے! ہو بہو ہم اس کو اب تک اپنا نہ پائے یہ عاصی کرنالی کا انشائیہ کچھ امید دلائے کہ یہ نقل با آخر پائے کا اصل ناک نقشہ پائے!

خان صاحب کے خط کی طرح آپ نے سرور انبالوی کے عمدہ خط میں حوالے کی اصلاح کر کے منصبی فریضہ خوب نبھایا ہے۔ فاضل مکتوب نگار اس کو درخور اعتنا مانے جانے۔ شعر کا کلی مفہوم بے شک بام کی بجائے بال سے ہی بجا کھلتا ہے۔ یہاں مکیں کی جگہ کمیں کو املا کا سہو لیں۔ اب ایسے ہی سہو کی بات آگے بڑھاؤں۔ محمود رحیم نے فرزانہ نیناں کی غزل کو سراہتے ہوئے کہ اور کے کی چٹکی لیتے وقت غور کر لیا ہوتا کہ یہ بھی املا کا شاخسانہ ہو سکتا ہے اس سے پہلے ہی کہ چیخیں۔۔۔! نیناں کا کلام پچھلے شمارے میں باعث توجہ ہوا۔ اس مرتبہ آپ نے برطانیہ کے مشاق شعر عشاق اساتذہ کی نگارشات کو زینت الاقرباء بنا کر اسے برطانیہ کے مشہور ارشاد عثمانی کے 'پرواز' اور شہرزاد کا ہم پلہ بنا دیا ہے اور وہاں کے پرانے لندنی 'صدا' کو تو کھلی مات دے دی ہے۔ ایں کار از تو آید۔ ڈاکٹر مختار اکبر حیدر آبادی (دکھنی) اور صباحت عاصم کا کلام ہمیں دھیان سے مطالعہ کرنا درکار ہے کہ معلوم ہو وہاں ہمارے اردو دوست اہل فن سخن گوئی میں کیا کیا زاویئے نکال رہے ہیں۔ امریکہ میں ہمارے بزم کے ساتھی بھی اس ادب دوستی سے مستفید ہونا چاہتے ہیں ان کے چند عمدہ افسانے میرے پاس پڑے ہیں کہیں تو میں وہ بھی بھجوادوں۔ کہا جائے اب الاقرباء بداہتہً بین الاقوامی افق پر پرواز کناں ہے۔

آج نہ جانے مشکور حسین یاد نے یکا یک ٹیلی فون پر یاد کر لیا اور بتایا ناروے سویڈن کی یاترا پر روانہ

ہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ ان کی غزل کے بارے میں ابھی ابھی کچھ چبھتی باتیں لکھ کر ہٹا ہوں' میری سنی ان سنی کرتے ہوئے بولے پرتو صاحب کی غالب شناسی کے بھرم کا پول کھولتے ہوئے الاقرباء کو ایک خط ڈاک میں ڈالا ہے' اگلے شمارے میں چھپ جائے تو بتایئے کیسا رہے گا۔ یا وحشت ایک طرف یہ دلدار اور دوسری طرف یار طرحدار۔۔ کیا کروں کہاں جاؤں اب تو خود کو منصور عاقل کے پردے ہی میں چھپاؤں تو بچوں بچاؤں۔ میں یاد کے اور کئی گنوں کے گیت گاؤں اور خاطر میں نہ لاؤں تو ان کی غزل گوئی کو۔ بلکہ برملا جتاؤں یا مظہر العجائب غزل حاضر تغزل غائب۔ یاد صاحب اول تو طرح ہی بے طرح نکالیں اور اس میں ایسے من مانے خیال اور اظہار ڈالیں کہ تغزل سے یکسر دور جا پڑیں تاہم اس کی زلف سے یوں لڑیں تو مزہ کچھ دے جائے تو انوکھا نرالا پن جو غزل کے مزاج سے لگا نہ کھائے۔

اب پلٹوں محشر زیدی کے بہت ہی معلوماتی مقالے کی طرف۔ واقعی شمس العلماء علامہ تاجور کا ذکر خیر کر کے انہوں نے اپنی ادبی عاقبت سنوار لی ہے علامہ مرحوم و مغفور سے میری بھی دیرینہ نیاز مندی رہی ہے۔ ہمارا ایک پشاوری صراف بچہ دوست چونی لال کاوش تاجور مرحوم کے قریبی مصاحبوں میں شامل تھا اور لاہور میں ان کے آستانے پر حاضر رہتا تھا۔ جب ہم نے سرحد میں اردو سبھا بنائی تو وہ برابر کا ہمدست تھا۔ اس کے مشورے پر اپنے ۱۹۴۴ء کے کل ہند مشاعرے میں علامہ کو بھی مدعو کیا گیا اور انہوں نے حضرت جگر مراد آبادی اور سردار عبدالرب نشتر کی طرح اس کی ایک نشست میں صدارت فرمائی۔ اس کے بعد بھی وہ بارہا ہمارے پشاور کے جلسوں نشستوں میں رونق افروز ہوئے۔ یہ چونی لال جسے اول اول ہم تمسخر سے چونی لعل کہتے تھے پھر ہمارے ہی ادارے سے آغا کاوش موسوم ہوا اور تقسیم عظیم کے بعد وہ بمبئی سدھار گیا۔ اس نے وہاں تاجور اکادمی بنائی اور بٹوارہ نام سے ایک ناول بھی لکھا جسے بعد ازاں فلمایا گیا۔ اس نے مجھے اپنی کتاب کی ایک جلد بھی بھیجی تھی۔ تاہم جب میں پچھلی صدی کی آٹھویں دہائی میں اپنے کالج کے دوست چمن لال کو ملنے بمبئی گیا تو اسے بہت ڈھونڈا مگر نہ ملا اور نہ ہی اس کی تاجور اکادمی کا کوئی نام نشان پایا۔۔۔ رہے نام اللہ کا۔

اب علامہ تاجور کی حیات بے ثبات کے ایک اور پہلو سے پردہ سرکاؤں جس کا شاید محشر زیدی کو علم نہ ہو ورنہ ضرور معرض تحریر میں لاتے۔ پہلے میرا ایک قطعہ پڑھ لیں:

ذوق سے آگے' جو داغ آزاد اور اقبال نے    قائم انداز بیاں رکھا زباں دانی کے ساتھ
تاجور سے تا عدم آیا تو شوکت ہم نے وہ    برقرار آئندہ رکھا کیسی آسانی کے ساتھ

اور یہ کیونکر ہو رہا ہے سنئے:

شوکت ملا عدم سے قرینہ کمال کا　　　　شیرازہ باندھتے ہیں پریشاں خیال کا

میں ادب کو حاضر ناظر جان کر سوانح نگاران علم وفن کی عدالت میں مصدقہ بیان قلمبند کراؤں کہ مولانا محمد حسین آزاد اور نواب مرزا داغ کی استاد ذوق سے شاگردانہ وابستگی مسلمہ تاریخی حقیقت اور نواب داغ سے علامہ اقبال کی نیاز مندانہ عقیدت اس نظم سے ثابت جوانہوں نے داغ کی رحلت پر کہی اور بانگ درا میں شامل ہے۔ مولانا تاجور بھی داغ کے حلقہء تلامذہ میں بصد فخر شریک رہے تھے اور عام طور سے یہ معلوم نہ بھی سہی مگر ابو البیان عدم نے بھی ابتدا میں شمس العلماء کے مشوروں سے استفادہ کیا اور ان کے زیر ادارت چھپنے والے مؤقر جریدے " شہکار" میں نمایاں جگہ پاتے رہے اور یوں بہت جلد بام شہرت پر پہنچ گئے۔ مابعد علامہ نیاز فتح پوری کے "نگار" کامل معیار میں چھپنے لگے تو ہندوستان بھر میں فوراً جانے پہچانے گئے۔ تب نام ایسے ہی نامی جریدوں کے توسط سے عام ہوا کرتا تھا اب تو کہئے ادب میں بھی باوا آدم نرالا!

مولانا تاجور کو بھی نواب داغ سے نسبت تھی اور عدم صاحب نے بھی اپنا ابتدائی سفر شاعری ان ہی کی رہنمائی میں شروع کیا' گو وہ احسان دانش کی طرح ان کے حلقہ تلمذ میں داخل نہ ہوئے۔

محسوس کرر ہا ہوں یہ مراسلہ مقالہ درازتر ہوتا چلا گیا۔ اب آپ اس سے جو مناسب سلوک فرمائیں مجھے ردو کد نہ ہو' بس یہ جانیں کہ زلف کی بات چلی اور چلتی چلی گئی! الذیذ بود حکایت درازتر گفتم!!

## پروفیسر محسن احسان۔ پشاور

الاقرباء اپریل تا جون ۲۰۰۳ء مل گیا تھا۔ کچھ مصروفیت رہی کچھ پشاور سے غیر حاضری اسلئے جواب میں تاخیر ہوگئی۔

ہر شمارہ پہلے سے زیادہ وقیع اور توانا ہوتا جا رہا ہے۔ جس خوش سلیقگی کا مظاہرہ آپ اس کے مواد کی چھان پھٹک میں کرتے ہیں ویسا ہی اس کی ظاہری شکل وصورت میں بھی ملتا ہے۔ تین ماہ کے بعد اس کی آمد کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔

اداریے سے بات شروع کی جائے۔ گزشتہ اداریوں کی طرح اب کے بھی آپ نے ادب اور نظریہ ضرورت کے تحت بڑی اہم باتیں چھیڑی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ سیاست کی طرح نظریہ ضرورت ادب میں بھی داخل ہوگیا ہے اور آپ کے اداریے کے آخری جملے نے تو چونکا دیا۔ مجھے بھی خوف آتا ہے کہ خس وخاشاک کا

سیل بلاخیر کہیں ادب کے صحت مند اور توانا رجحانات کو بھی برباد نہ کر دے۔ جس شدت سے کم تر تخلیقی کتب کی بھرمار ہو رہی ہے اس نے اعلیٰ تخلیقی ادب کو کھڈے لگا دیا ہے۔ اس رجحان کو ختم کرنے کیلئے اچھے معیاری ادبی رسائل کی ضرورت ہے۔

شاہ ولی اللہ کے بارے میں ڈاکٹر شاہد حسن رضوی کا مضمون مختصر مگر جامع ہے۔ اس طرح اپنی میری شمل کے بارے میں ڈاکٹر محمد معز الدین اور محمود اختر سعید کے مضامین معلومات افزا بھی ہیں اور مرحومہ کی حیات اور ادبی خدمات پر بھرپور روشنی ڈالتے ہیں۔ نوید ظفر کا خنجراب اور ہندوکش بھی دلچسپ ہے اور نئی معلومات سے پُر۔ ڈاکٹر عاصی کرنالی ادب اور قومی شعور پر انشائیہ کی صورت اظہار خیال کر کے نئے پہلوؤں سے بات کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ سیدہ نغمہ زیدی نے ''وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ'' کافی حوالوں سے لکھا ہے وہ اچھی نثر لکھتی ہیں اس بار بھی انہوں نے عورت کے ہر روپ پر بھرپور روشنی ڈالی ہے، خصوصاً ماں کے روپ پر۔ کہ یہی روپ عظیم تر روپ ہے۔ محمد شفیع عارف دہلوی نے قابل گلاؤٹھوی کے بارے میں بڑی دلچسپ باتیں کہی ہیں۔ قابل صاحب کا قیام کچھ عرصہ پشاور میں بھی رہا۔ ان سے چند ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ پھر اس دیار سے گئے تو لوٹ کر نہیں آئے۔ ان کا کلیات تو موجود ہے۔ کلاسیکی انداز کے اچھے غزل گو تھے۔

تازہ منظومات میں صادق نسیم، اکبر حیدر آبادی، توصیف تبسم، محسن بھوپالی، خیال امروہوی، صباحت عاصم، سرور انبالوی، مشکور حسین یاد، طاہر تونسوی، شاکر کنڈان اور ارشد محمود ناشاد کی غزلیں اچھی لگیں۔ ہمارے عہد میں اچھے غزل گو موجود ہیں اور ان کی تخلیقات سے الاقرباء کی آبرو بڑھتی ہے۔ حمایت علی شاعر کا المیہ بڑا شدید ہے۔ رفیق حیات کا بچھڑنا رگ جاں کے کٹ جانے کے المیے سے کم نہیں۔ حمایت نے کئی نظمیں لکھیں ان کا درد ہر لفظ سے عیاں ہے۔

## سرور انبالوی۔ راولپنڈی

''الاقرباء'' برابر موصول ہو رہا ہے جس کے لئے انتہائی ممنون ہوں۔ آپ جس خلوص، لگن، محبت اور جانسوزی سے پرچہ مرتب کر رہے ہیں اس سے زبان و ادب اور وطن سے آپ کی شیفتگی اور والہانہ محبت کا اظہار ہوتا ہے اتنے تحقیقی، جاندار اور دلچسپ مضامین کا حصول اور پھر ان کی ترتیب و تدوین کوئی آسان کام نہیں یہ بڑی پتہ ماری کا کام ہے۔

انہیں کا کام ہے یہ حوصلے ہیں جن کے زیاد

جیسا کہ میں نے اپنے پچھلے مراسلہ میں وعدہ کیا تھا علامہ اقبال سے متعلق مراثی پر ایک مضمون ارسال ہے مضمون میں نے انہیں مراثی تک محدود رکھا ہے جو علامہ اقبال کی وفات کے فوری بعد لکھے گئے یا پھر زیادہ سے زیادہ ان کے سال وفات ۱۹۳۸ء میں لکھے گئے ورنہ تو ان پر لکھے جانے والے مراثی اور تاثراتی نظموں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے جن کا احاطہ مشکل ہے۔

بعض مراثی خاصے طویل ہیں لیکن میں نے پورے پورے اس لئے نقل کر دئے ہیں کہ حرف گیری نہ ہو سکے کہ فلاں مرثیہ ادھورا ہے اور پھر میری یہ کوشش تھی کہ اوائل کے لکھے ہوئے مراثی میں سے کوئی مرثیہ رہ نہ جائے اس باب میں میں نے حتی الوسع کوشش کی ہے کہ کم از کم ۱۹۳۸ء میں کہے گئے مراثی تو اس مقالہ میں شامل ہو جائیں ہو سکتا ہے کہ اب بھی بہت سے مراثی رہ گئے ہوں۔ ☆

اپنی ایک تالیف ''صحرا میں چاند'' بھی ارسال خدمت ہے وصولیابی سے مطلع فرمائیں۔ آپ نے فون پر علامہ قابل گلاؤٹھوی مرحوم کے کلیات مرحمت فرمانے کا تذکرہ کیا تھا مصروفیات کی وجہ سے آپ کو خیال نہ رہا۔ اگر اس کی ایک جلد بھجوا دیں تو انتہائی شکر گزار رہوں گا۔

## صادق نسیم ۔ اسلام آباد

زندگی میں بہت سی باتیں ایسی ہو جاتی ہیں جنہیں ''عجوبہ'' کہا جا سکتا ہے مرزا بیدل نے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے غالب کے ایک شعر کا جواب لکھ دیا جو غالباً مرزا غالب کی نظر سے نہیں گزرا ہو گا۔ بیدل کا شعر ہے

مدعی درگزر از دعویٔ طرز بیدل　　　سحر مشکل کہ بہ کیفیت اعجاز رسد

اگر غالب کے ذہن مبارک میں یہ شعر رہ جاتا تو شاید وہ یہ شعر نہ کہتے

طرز بیدل میں ریختہ کہنا　　　اسد اللہ خاں قیامت ہے

بالکل اسی طرح محترم سرور انبالوی صاحب نے میرے مضمون میں اس بات کی سند مانگی ہے کہ

---

☆ فاضل مراسلہ نگار کا متذکرہ مضمون زیر نظر شمارہ میں شریک اشاعت ہے لیکن ہم فاضل مقالہ نگار اور محترم قارئین سے معذرت خواہ ہیں کہ ''گلہ ہے شوق کو بھی دل میں تنگی جا کا'' کے مصداق بوجوہ تلخیص پر مجبور ہوئے ہیں (ادارہ)

احاطہ مزار مولانا رومی میں علامہ اقبال کی فرضی قبر موجود ہے۔

اس سے پہلے کہ میں جواباً کچھ عرض کرتا۔ قابل احترام سفیر ترکی کا بیان ۵ مئی نوائے وقت کے پہلے صفحہ پر چھپ گیا کہ احاطہ مزار رومی میں علامہ اقبال کی فرضی قبر موجود ہے۔

میری طرف سے ڈاکٹر جاوید اقبال کی کتاب ''یادیں'' میں علامہ کے فرضی مزار کی تصویر موجود ہے جو آپ کی خدمت میں طباعت کے لئے حاضر کر رہا ہوں۔
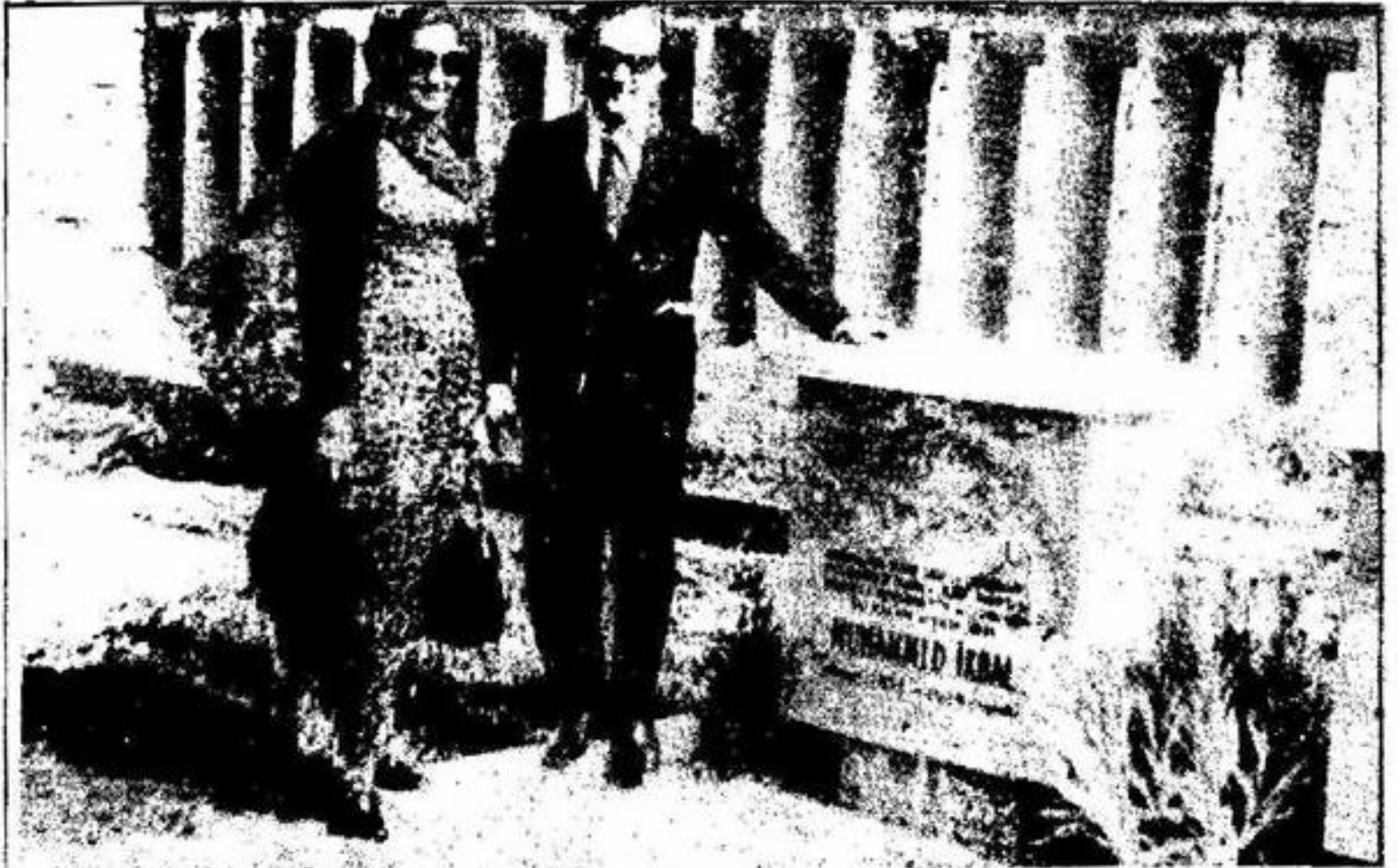
قونیہ (ترکی) میں مولانا رومی کے مزار کے احاطے میں علامہ اقبال کی فرضی قبر پر جاوید اقبال اور ان کی اہلیہ بیگم ناصرہ کھڑے ہیں

## انوار فیروز۔ راولپنڈی

الاقرباء کا اپریل سے جون ۲۰۰۳ء کا شمارہ مجھے ۲۰ اپریل کو مل گیا تھا۔ پرچہ بہت شاندار ہے۔ تمام تخلیقات معیاری ہیں۔

اس وقت میں جناب سرور انبالوی کے ایک خط کے بارے میں وضاحت کرنا چاہتا ہوں' انہوں نے لکھا ہے کہ صادق نسیم نے اپنے مضمون میں مزار رومی میں علامہ اقبال کی فرضی قبر کا ذکر کیا ہے اس کی سند کہیں نہیں ملی۔

میں نے یہ فرضی قبر دو مرتبہ دیکھی ہے' ایک بار جب ۱۹۷۴ء میں ترکی کے دورے پر صحافیوں کے

وفد کے ہمراہ گیا۔ باہر لان میں علامہ اقبال کی فرضی قبر موجود تھی۔ میں نے اس کی تصویر بھی کھینچی تھی جو شاید میرے ریکارڈ میں موجود ہوگی۔ مل گئی تو بھیجوں گا۔ دوسری بار میں سابق صدر جنرل محمد ضیاء الحق کے ہمراہ ترکی کے دورے پر گیا۔ تب پھر مزار رومی پر حاضری دی۔ اور علامہ اقبال کی فرضی قبر بھی دیکھی بلکہ جنرل صاحب نے بھی وہاں حاضری دی۔

## سلطان صبر وانی۔ راولپنڈی

اپریل تا جون ۲۰۰۳ء کے سہ ماہی شمارے میں دعا اور غزل شریک اشاعت فرمانے پر میں آپ کا شکرگزار ہوں

آپ کا اداریہ حسب معمول پھر توجہ طلب ہے۔ ادب اور نظریہ ضرورت عنوان سے آپ نے جس ادبی منظر سے نقاب اٹھایا ہے اور صورت حال کو نہایت واضح طور پر جس طرح بے حجاب کیا ہے واقعی یہ ہم سب کے لئے ایک لمحہ فکریہ ہے۔ خداوند عظیم آپ کے ذہن و قلم کو جرأت عطا فرماتا رہے اور آپ اردو ادب کے متعلق مزید تاریک گوشوں کو اہل علم و ذی شعور صاحبان قلم کے سامنے لاتے رہیں۔ اور صاحبان اقتدار بھی اس پر سنجیدگی سے غور و فکر کریں۔ سردست تو پروفیسر مشکور حسین یاد کے بقول ہم اور آپ صرف دعا ہی کر سکتے ہیں۔

میں اس عریضے کے ہمراہ دو غزلیں آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں جو کہ آپ کی شرط کے مطابق غیر مطبوعہ ہیں۔

## محمد شفیع عارف دہلوی۔ کراچی

الاقرباء کا تازہ شمارہ جنوری تا مارچ ۲۰۰۳ء نظر افروز ہوا۔ جناب نے میرے عزیز دوست قابل گلاؤٹھوی پر میرا مضمون جو کبھی میں نے مظفر احمد ضیاء مرحوم کے ارشاد پر سپرد قلم کیا تھا شائع فرمایا اس کے لئے شکریہ قبول فرمایئے۔

آج جب یہ مضمون پڑھا تو پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ قابل بھائی کا معصوم متبسم چہرہ افق ذہن پر ابھرا۔ دل کی محرابوں پر محبت کے چراغ جھلملائے اور چند ستارے سر مژگاں آکر منجمد ہو گئے۔ پھر کیا تھا ایک فلم تھی جو فانوس خیال کی طرح نظروں کے سامنے گھومنے لگی۔ ہائے کیا دور تھا اور کیسے کیسے صاحب فن اور باکمال لوگ موجود تھے جو وقت کے ساتھ ساتھ آسودہ خاک ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند تر فرمائے۔

## حبیب اللہ اوج۔لاہور

آپ جس محنت اور مشقت سے سہ ماہی الاقرباء مرتب فرماتے ہیں۔ مضامین کا تنوع، نظم و نثر کا انتخاب اور پھر آپ کا فکر انگیز اداریہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قدرت نے بھرپور فیاضی سے کام لے کر آپ کو یہ صفات ودیعت کی ہیں ورنہ اس دور پر آشوب میں جبکہ صرف Utility Bills ہی قوت لایموت کے تمام ذرائع ہڑپ کر جاتے ہیں۔ اس آن بان اور شان کا رسالہ مرتب کرنا۔ یہ آپ ہی کا حصہ ہے۔

## حمایت علی شاعر۔کراچی

شرمندہ ہوں کہ بہت دنوں بعد مخاطب ہو رہا ہوں۔ اس دوران میں آپ کا ایک خط بھی ملا۔ مگر میں ہی اپنی جگہ نہیں تھا کبھی کراچی سے باہر رہا اور کبھی۔ کراچی ہی میں۔

طبیعت اچاٹ رہنے لگی تھی۔ اب دوستوں کے اصرار پر دو ایک محفلوں میں شریک ہوا ہوں پچھلے دنوں ایک شام میرے ساتھ منائی گئی۔ پھر چند دوستوں نے میرے فلمی نغمات خدا جانے کہاں کہاں سے جمع کر کے ایک کتاب کی صورت شائع کر دیئے۔ ''تجھ کو معلوم نہیں'' (آپ کو بھیج رہا ہوں)

اس تقریب میں شرکت کی۔ بیشتر خوش گلو فن کاروں نے میرے مقبول فلمی نغمات گا کر سنائے۔ رات گئے تک محفل جمی رہی۔ کتاب بھی ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ ایک رات میں ڈھائی سو کتابیں بک گئیں۔ میرے نغمات کے سی ڈی بھی بہت فروخت ہوئے۔ مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ میرے فلمی نغمات کتنے مقبول ہیں حالانکہ وہ فلمیں اب سے چالیس سال پہلے بنی تھیں۔ فلم انڈسٹری چھوڑے بھی مجھے ۳۵ سال ہو چکے ہیں۔

## شاہد واسطی۔لاہور

شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے پرچے کی پالیسی کے بارے میں تحریر فرمایا۔ جہاں تک ترسیل الاقرباء کا تعلق ہے۔ مجھے وہ پرچہ جس میں میری مناجات شائع ہوئی تھی ملا تھا۔ بعدازاں کوئی پرچہ نہیں ملا۔ اس میں آپ کا ادارہ قصوروار نہیں ہے۔ ہمارے علاقے میں ڈاک چوری ہو رہی ہے۔ بمبئی سے ''شاعر'' اور لاہور سے ''الحمرا'' بھی نہیں ملے۔ شکایت کی ہے۔

## محمود رحیم۔ اسلام آباد

موجودہ شمارے میں آپ کا تحریر کردہ اداریہ ''ادب اور نظریہ ضرورت'' بڑی اہم تحریر ہے جس میں آپ نے ان سچائیوں اور حقیقتوں کا ذکر کیا ہے جنہیں آج کل گوشتہ لب پر لانے کی بجائے اکثر مصلحت کی صلیب پر چڑھا دیا جاتا ہے۔ موجودہ عہد کا تخلیق کار بھی خود غرضی' لالچ' ہوس اور ترغیب کا شکار ہو چکا ہے جس کی وجہ سے انسانیت کی بنیادی قدریں جن کا تحفظ ادب کا وظیفہ ہے' خود تخلیق کاروں کے کردار میں مفقود ہیں۔ پیسے کے حصول کے بے لگام جذبے اور اپنے نام و ذات کی سستی تشہیر کے باعث آج کے ادب کو پی۔ آر نے ہائی جیک کر رکھا ہے۔ ٹی وی' ریڈیو' اخبارات اور شہروں میں ہونے والی ادبی تقریبات کے پیچھے جھانک کر اگر دیکھا جائے تو سب اسی پی۔ آر کا کرشمہ نظر آئے گا۔ اب تو اس سے بھی بڑھ کر کچھ لوگوں نے ادب اور ادیب دونوں کو بلیک میل کرنے کا ہنر سیکھ لیا ہے' وہ اس طرح کہ اپنی پی آر کے زینے کے سہارے کوئی ادبی تنظیم بنائی اور ادب و ادیب کو آگے بڑھانے کی بجائے صرف اپنی ذات کی پروجیکشن کی۔ یہ بلیک میلنگ نہیں تو اور کیا ہے؟ ایسے ہی لوگ ہیں ادیب اور تخلیق کار کی فلاح کے لئے مختص فنڈز کو اندر ہی اندر دیمک کی طرح کھا جاتے ہیں۔

اللہ آپ کے حوصلوں کو افزوں کرے۔ ایک غزل اور ایک نعت ارسال کر رہا ہوں۔

## محبّ عارفی۔ کراچی

جناب کا گراں قدر عطیہ الاقرباء شمارہ بابت اپریل تا جون ۲۰۰۳ء موصول ہوا۔ بے حد و حساب شکریہ۔ ضعف پیری و بینائی نے مجھے بہ حیثیت شاعر و ادیب زندہ در گور کر دیا ہے۔ آپ کے رسالے کے خاص خاص مندرجات کسی مہربان سے پڑھوا کر سنوں گا۔

## زہیر کنجاہی۔ راولپنڈی

موجودہ شمارے کا اداریہ پڑھنے اور سمجھنے والی تخلیق ہے۔ اداریہ تو تقریباً ہر شمارے کا قابل تعریف ہی ہوتا ہے۔ اور ایک اچھے مدیر کی پہچان اداریہ ہی ہوتا ہے۔ ''ادب اور نظریہ ضرورت'' کے تحت آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ بالکل مناسب اور درست ہے۔

جناب محشر زیدی' عارف دہلوی اور سیدہ نغمہ زیدی کے مقالات پسند آئے۔ پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی کے ''انشائیہ'' کا کیا کہنا! موصوف نے ملا وجہی کی ''سب رس'' کے انداز میں ''ادب اور قومی شعور'' کے

بارے میں بہت عمدہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔

غزلیات سے کچھ اشعار بہت پسند آئے۔ مراسلات کا حصہ بھی خوب روشن ہے۔ جناب سرور انبالوی کا مراسلہ بہت جامع ہے۔ ہمیں سرور صاحب کے موعودہ مضمون کا انتظار رہے گا۔ امید ہے کہ ان کا مذکورہ مضمون بھی ''الاقربا'' کے اوراق کی زینت بنے گا۔

## نکہت بریلوی۔ کراچی

الاقرباء کا تازہ شمارہ نمبر نظر نواز ہوا۔ آپ کی اس پرخلوص عنایت کے لیے ممنون ہوں۔ آپ بہت قرینے سے نہایت اعلیٰ مواد پیش فرمارہے ہیں گزشتہ ۲ ماہ سے آنکھوں میں تکلیف کی وجہ سے پڑھنے لکھنے میں ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق احتیاط برت رہا ہوں۔ آرام آتے ہی موصولہ شماروں کے مندرجات کے بارے میں حاصل مطالعہ کے طور پر اپنی رائے پیش کروں گا انشاء اللہ۔

سردست ایک نعتیہ نظم مل گئی ہے اگر مناسب ہو تو آئندہ کسی شمارے میں شامل اشاعت فرمائیں۔

## میاں سعید الرحمٰن۔ پشاور

ہر شمارہ خوب سے خوب تر کی طرف رواں ہے۔ رب العزت آپ کی لگن اور ہمت کو برقرار رکھے۔ اس مرتبہ تو شمس العلماء علامہ تاجور نجیب آبادی کے ذکر نے پرانی یادوں کو تازہ کردیا۔ ۱۹۴۹۔۱۹۵۰ء میں دیال سنگھ کالج میں ان کی محبتوں سے سرفراز ہونے کا شرف حاصل رہا۔ ادبی دنیا کی ممتاز ہستیاں وہاں موجود تھیں۔ عابد علی عابد پرنسپل۔ پروفیسر خادم محی الدین (ضیا محی الدین کے والد) وائس پرنسپل تھے۔ ان دنوں سعادت حسن منٹو کے ایک افسانے پر عریانی کا مقدمہ تھا۔ علامہ تاجور مرحوم افسانے کی مخالفت میں پیش ہوئے تھے۔ جب کہ عابد علی عابد کی دختر افسانے کے دفاع میں۔ ماہنامہ کلچر لاہور کا تاجور نمبر میرے ریکارڈ میں موجود ہے۔

## شاکر کنڈان۔ سرگودھا

الاقرباء اپریل تا جون ۲۰۰۳ء موصول ہوا۔ ممنون ہوں۔ میرے خیال میں پرچے کی خوبصورت تحریروں کی تعریف نہ کرنا بخیلی ہوگی۔ شاعری اور نثر دونوں اپنی اپنی جگہ خوب سے خوب تر ہیں۔ پرچے کو دیکھ کر اور پڑھ کر آپ کے حسن ذوق اور کڑے انتخاب کی داد دینا پڑتی ہے۔ اللہ کرے کہ یہی صورت برقرار رہے۔

## ثناء اللہ کنجاہی۔واہ کینٹ

سب سے پہلے میری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیے کہ ''الاقرباء'' کی صورت میں آپ ایک کامیاب تحریک کورواں رکھے ہوئے ہیں۔ مجھے آپ کے ایک دوشمارے (گزشتہ) پڑھنے کا اتفاق ہوا' میں نے بغور مطالعہ کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ آپ ادب کی سرزمین کی صحیح آبیاری کررہے ہیں۔ کتاب میں شامل تمام مضامین' غزلیں' اورادبی فن پارے کسی بھی طرح غیر معیاری نہیں ہوتے بلکہ آپ کے ذوق انتخاب میں محنت شاقہ کی تصدیق کرتے ہیں۔

میں ۱۹۸۷ء سے نثر لکھتا آرہا ہوں۔ایک کالج میں لیکچرار ہوں' اورادب کا ایک شائق۔

## نوید سروش۔میرپورخاص (سندھ)

آپ کی عنایتوں کے لئے سراپا ممنون ہوں۔آپ جس ذوق وشوق سے ''الاقرباء'' کو ترتیب دیتے ہیں وہ قابل تحسین بھی ہے اور لائق تقلید بھی۔آپ کی محبت اور محنت نے پرچے کو نہ صرف دلچسپ بلکہ متنوع بنادیا ہے۔ تفصیلی خط بعد میں تحریر کروں گا۔

## ڈاکٹر محمد منیر حسن۔راولپنڈی

آپ کے خوبصورت جریدے' سہ ماہی الاقرباء اسلام آباد کا تازہ شمارہ حال ہی میں مجھے ملا۔اس سے پہلے بھی مجھے اس کے تین شمارے مل چکے ہیں جن کو میں نے بڑے شوق سے پڑھا۔ مجھے یادرکھنے اور میرا نام اپنی لسٹ میں شامل کرنے کا بہت بہت شکریہ۔

اس سے پہلے میں ساری عمر انجینئرنگ اور سائنسی جرائد پڑھتا رہا۔اورادبی رسائل پڑھنے کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔اب یہ تبدیلی اچھی لگی ہے۔اس کے مضامین کافی معیاری' معلوماتی اور تحقیقی بھی ہوتے ہیں اور کیوں نہ ہوں جب اس کے لکھنے والوں میں نامی گرامی اور قابل اشخاص شامل ہیں۔

شعروشاعری سے میری دلچسپی صرف واجبی رہی ہے۔علامہ اقبال کی منظومات' غالب اور دوسرے پرانے شعراء کی غزلوں کے چند اشعار سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ہوسکتا ہے کہ اب آپ کا یہ رسالہ پڑھ کر دلچسپی پیدا ہوجائے۔

خبر نامہ

# الاقرباء فاؤنڈیشن

(اراکین کے لئے)

مرتبہ

شہلا احمد

# احوال وکوائف

## کھیوڑہ سالٹ رینج کا تعلیمی وتفریحی دورہ

مجلس انتظامیہ الاقرباء فاؤنڈیشن نے ۱۳ اپریل بروز اتوار ۲۰۰۳ء کو کھیوڑہ سالٹ رینج کے تعلیمی و تفریحی دورے کا اہتمام کیا۔ جس میں اراکین فاؤنڈیشن نے اپنے اہل خانہ اور بعض مہمانان گرامی کے ہمراہ شرکت کی۔ وہاں سب نے کھیوڑہ مائنز کی سیر کی اور اہم مقامات کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور خوب لطف اٹھایا۔

## سیدہ صباحت منصور کی ایم بی بی ایس میں شاندار کامیابی

سیدہ صباحت منصور صدر الاقرباء فاؤنڈیشن جناب سید منصور عاقل کی ہونہار صاحبزادی ہیں۔ انہوں نے ماشاء اللہ ایم بی بی ایس کا امتحان راولپنڈی میڈیکل کالج سے اعزازی حیثیت میں پاس کیا ہے۔ ادارہ اس کامیابی پر عزیزہ صباحت منصور، محترم منصور عاقل و بیگم ناہید منصور اور دیگر اہل خانہ کو مبارکباد پیش کرتا ہے اور مستقبل میں ہر شعبۂ زندگی میں عزیزہ صباحت کی بہترین کامیابیوں کیلئے دعاگو ہے۔

## علی ہانی کی تعلیمی شعبے میں اعلیٰ کارکردگی

الاقرباء فاؤنڈیشن کے رکن جناب ایم ایم شیخ و بیگم نجمہ شیخ کے ہونہار فرزند عزیزی علی ہانی نے اقراء یونیورسٹی اسلام آباد سے ایم سی ایس (MCS) جی پی اے (GPA) 3.75 میں شاندار کامیابی حاصل کی ہے وہ پوری یونیورسٹی میں سیکنڈ جبکہ اپنے ڈیپارٹمنٹ میں فرسٹ آئے ہیں۔ اس اعزاز پر انہیں اسکالرشپ کا بھی اہل قرار دیا گیا ہے۔

ادارہ اس شاندار کامیابی پر علی ہانی اور تمام اہل خانہ کو مبارکباد پیش کرتا ہے۔ اور مستقبل میں ایسی ہی بے شمار کامیابیوں کیلئے دعاگو ہے۔

## کیپٹن ڈاکٹر عدیل حسین گردیزی کی دعوت ولیمہ

کیپٹن ڈاکٹر عدیل گردیزی اپنی دلہن شمائلہ کے ساتھ

مجلس انتظامیہ الاقرباء فاؤنڈیشن کے رکن جناب فہیم احمد گردیزی و بیگم عفت گردیزی نے ۱۷ مئی ۲۰۰۳ء بروز ہفتہ اپنے فرزند ارجمند کیپٹن ڈاکٹر عدیل حسین گردیزی کی دعوت ولیمہ کا میریٹ ہوٹل اسلام آباد میں اہتمام کیا۔ جس میں عزیز و اقارب اور احباب کے علاوہ الاقرباء فاؤنڈیشن کے ممبران کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔ ادارہ اس پر مسرت موقع پر جناب فہیم احمد و بیگم عفت فہیم دولہا و دلہن اور دیگر اہل خانہ کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے دعا گو ہے کہ زندگی کے اس حسین سفر میں عزیزی عدیل حسین و دلہن شمائلہ عدیل سدا خوش و خرم اور شاد و آباد رہیں۔ آمین

## ریحان سید کا اعزاز

مجلس منتظمہ الاقرباء فاؤنڈیشن کے رکن محترم سید آفتاب احمد کے فرزند ریحان سید کا سٹی بنک دوبئی میں بحیثیت کلائنٹ ریلشن شپ مینجر تقرر ہوا ہے۔ جو ایک اعزاز کی بات اور خوشی کی خبر ہے۔ ادارہ اس پر مسرت موقع پر جناب سید آفتاب احمد بیگم طیبہ آفتاب عزیزی ریحان سید اور دیگر اہل خانہ کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔

## سید فرحان نذر زیدی کی امریکہ سے واپسی

مجلس انتظامیہ الاقرباء فاؤنڈیشن کے رکن جناب سید نذر علی زیدی کے فرزند سید فرحان نذر زیدی امریکہ سے کمپیوٹر انجینئرنگ میں ایم ایس مکمل کر کے وطن واپس آگئے ہیں۔ امریکہ میں وہ ایک مشہور کمپنی سے وابستہ رہے۔ لیکن وطن عزیز کی محبت اور والدین کی خدمت کا جذبہ انہیں یہاں واپس لے آیا۔ آج کل وہ اسلام آباد میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں بحیثیت مینجر فرائض انجام دے رہے ہیں۔

ادارہ ان کے اس جذبہ کی قدر کرتا ہے اور مستقبل میں ان کی کامیابیوں کیلئے دعا گو ہے۔

# ڈاکٹر سیدہ صباحت منصور رشتہ ازدواج میں منسلک ہوگئیں

صدر الاقرباء فاؤنڈیشن جناب سید منصور عاقل و بیگم ناہید منصور کی دختر نیک اختر ڈاکٹر سیدہ صباحت منصور کی شادی کی تقاریب ۲۸ اپریل سے ۵ مئی ۲۰۰۳ء تک اسلام آباد میں پوری آب و تاب کے ساتھ منعقد ہوئیں۔ مائیوں کی تقریب جناب و بیگم منصور عاقل کے دولت کدہ واقع ایف 7/2 میں منعقد ہوئی جس میں قریبی رشتہ داروں کے علاوہ عزیزہ صباحت کی راولپنڈی میڈیکل کالج کی ہم سبق طالبات نے بڑی تعداد میں حصہ لیا جبکہ مہندی کی تقریب نیول ہیڈکوارٹرز کمپلیکس کے سبزہ زار پر رنگا رنگ قمقموں کی روشنیوں اور رونق افروز آرائشوں سے مزین وسیع پنڈال میں منعقد ہوئی جہاں زرد پھولوں سے آراستہ ''جھولا سٹیج'' حاضرین کی توجہ کا مرکز بنا رہا۔ پر تکلف عشائیہ کے بعد رات گئے تک محفل موسیقی جاری رہی جسے حاضرین نے بے حد پسند کیا اور اپنی پسند کی غزلیں سن کر فنکاروں کو خوب داد دی۔

ڈاکٹر صمد تجمل ہاشمی (دُلہا) اور ڈاکٹر سیدہ صباحت منصور (دُلہن)

یکم ربیع الاول ۱۴۲۴ھ مطابق ۴ مئی ۲۰۰۳ء یکشنبہ کو عزیزہ صباحت منصور کی رخصتی کی تقریب بھی نیول کمپلیکس ہی کے وسیع و عریض سبزہ زار پر منعقد ہوئی جس میں مہمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے شرکت کی جن میں عزیز و اقارب' احباب راولپنڈی میڈیکل کالج کی طالبات کے علاوہ وکلاء جج صاحبان' سفراء' اساتذہ' اہل قلم' دانشور صحافی اور سینئر بیوروکریٹ حضرات شامل تھے اس تقریب کا ایک نمایاں پہلو یہ تھا کہ

برات کا ہراول دستہ دولہا ڈاکٹر صمد تجمل ہاشمی کو لے کر نصف درجن گھوڑوں والی خوبصورت اور پھولوں سے مہکتی ہوئی بگھی میں پہنچا۔

ڈاکٹر صمد تجمل ہاشمی جو چند سال قبل پاکستان سے ایم بی بی ایس کی ڈگری لے کر انگلینڈ چلے گئے تھے وہاں کی یونیورسٹیوں سے مزید اسناد و علمی اعزازات حاصل کرنے کی سعادت حاصل کر چکے ہیں وہ آج کل برنسلے (ساؤتھ یارک شائر) کے ڈسٹرکٹ ہسپتال میں سینئر ہاؤس آفیسر ہیں عزیزہ صباحت بھی شادی کے بعد وہیں جا چکی ہیں اور برطانیہ ہی میں ہاؤس جاب کرنے کے ساتھ مزید میڈیکل تعلیم کے لئے کسی یونیورسٹی سے وابستہ ہونے کا ارادہ رکھتی ہیں۔

۵ مئی ۲۰۰۳ء کو دلہا کی جانب سے دعوت ولیمہ کا اہتمام ہوٹل سرینہ میں کیا گیا جہاں ایک پروقار عشائیہ ہال میں مہمانوں کو پر تکلف ضیافت دی گئی۔

## سارہ نذر زیدی کی بی سی ایس میں کامیابی

عزیزہ سارہ نذر زیدی جناب نذر علی زیدی ہی کی دختر نیک اختر ہیں۔ انہوں نے ہمدرد یونیورسٹی سے بی سی ایس کامیابی کے ساتھ مکمل کر لیا ہے۔ ادارہ انہیں اس کامیابی پر دلی مبارکباد دیتے ہوئے مستقبل میں مزید کامیابیوں کیلئے دعا گو ہے۔

## پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی

## ڈاکٹر سیدہ صباحت منصور کی رخصتی پر

## (ماں کے جذبات)

تو میری جاں ہے، کس دل سے کروں تجھ کو جدا بیٹی
عجب جذبہ ہے یہ، کہتے ہیں جس کو مامتا، بیٹی

یہی تقدیر بیٹی کی، یہی دستور فطرت کا
جدا ہونا تو ہے بیٹی کی قسمت کا لکھا، بیٹی

تری ڈولی پہ سایہ سارے رستے میری شفقت کا
تو میری مامتا کی چھاؤں میں سسرال جا بیٹی

نئے ماحول کی خوشبو کے اندر جذب ہو جانا
نئے گھر میں ہماری لاج رکھنا، دیکھنا بیٹی

ترے جانے سے کلیاں مسکرائیں، پھول کھل جائیں
قدم رکھنا نئے گلشن میں مانند صبا بیٹی

نیا آنگن تری مہکار سے لبریز ہو جائے
وہ خوشبو دے ترا گلدستہ صدق و صفا بیٹی

چمک اٹھے تری خوبی، دمک اٹھے ترا جوہر
کہ تو ہے میرے حسن تربیت کا آئنہ بیٹی

محبت تیرا شیوہ ہو، اطاعت تیرا مسلک ہو
ترے اعمال سے ظاہر ہوں آداب وفا بیٹی

سلیقہ، ہوشمندی، خدمت پیہم، وفاداری
انہی خوشرنگ تصویروں سے گھر اپنا سجا بیٹی

ملنساری مروت، نرم گوئی، راست کرداری
انہی اوصاف سے آنکھوں میں بس، دل میں سما بیٹی

تری ماں تجھ کو تسلیم و رضا کا درس دیتی ہے
کہ ہے عورت کا زیور خوئے تسلیم و رضا بیٹی

تجھے سسرال کے ہر فرد کی تعظیم کرنی ہے
مری خوش خلق بیٹی! میری تہذیب آشنا بیٹی

وہ تیرا ہم سفر، یعنی شریک زندگی تیرا
اطاعت اس کی، ہر لحظہ ہو تیرا مدعا بیٹی

تجھے کردار کی شمع فروزاں دے رہی ہوں میں
رہے یہ شمع تیرے ہاتھ میں روشن سدا بیٹی

زسرتاپا دعا ہوں میں تری رخصت کے موقع پر
نبیؐ کی رحمتیں بیٹی! خدا کا آسرا بیٹی

تمنا ہے مرادیں ہر قدم پر پھول برسائیں
دعا ہے تیری رہبر ہوں جناب فاطمہؓ بیٹی

ماں کے جذبات میں تمام اقرباء شریک ہیں
۴ مئی ۲۰۰۳ء (اتوار)

سراپا دعا:
بیگم و سید منصور عاقل

## سید رفیق عزیزی

# رُخصتی

برخورداری ڈاکٹر سیدہ صباحت بنت عزیزم سید منصور عاقل صاحب سلمہا بعقد مسنونہ ڈاکٹر صمد تجمل ہاشمی سلمہ اللہ تعالیٰ بیوم سعید یکم ربیع الاول ۱۴۲۴ ہجری۔ یکشنبہ چار ۴ مئی ۲۰۰۳ء شمسی

برخورداری صباحت کی رخصت کے لیے جو اشعار میں موزوں کرسکا ہوں، فریم میں تیار کرا کے دیتا اگر تقریب کراچی میں ہوتی۔

پیارے عاقل! میں اپنی تمام تر توجہ اور دعاؤں کے ساتھ اس مبارک تقریب میں شریک ہوں۔ رخصتی کے اشعار کیا اچھا ہو کہ میری طرف سے بیٹی کے دینے کے لیے، اچھی کتابت، اچھے فریم میں لگوا کر آپ رخصتی کے وقت بیٹی کے ساتھ بھجوا دیں۔

اے سیّدہ صباحت منصور شاد باد
حامی رہیں تمہارے شہ جملہ کائنات ﷺ
آنچل کی چھاؤں تم پہ رکھیں اماں عائشہؓ
احکام دین مصطفویؐ حرز جاں رہیں
تم کو عطا ہوں نعمتیں سارے جہان کی
زیور تمہارا، حسن عمل، عمر بھر رہے
ناموس دین احمد مرسل نہ بھولنا
بیٹی! تمہارے حسن عمل پر نہ آنچ آئے
سادات نے گھرانوں کو ہمرشتہ جب کیا
قائم رہے سہاگ تمہارا تمام عمر

اللہ ہر قدم پہ رکھے تم کو بامراد
تم پر لواء حمد کا سایہ ہو تاحیات
مسلک ہو صرف پیروی بنت مصطفےؐ
دلہا دلہن جہاں بھی رہیں شادماں رہیں
ہر اک کہے کہ لاج ہو تم خاندان کی
ہر مومنہ مثال تمہاری دیا کرے
پھر رحمت تمام کے جھولوں میں جھولنا
ہر صبح، اک نوید خوش آہنگ ساتھ لائے
ذات صمد نے عبد صمد تم کو دے دیا
ہر سال دیکھو مکہ مدینہ تمام عمر

سید رفیق عزیزی کی ہردم ہے یہ دعا
اللہ کے کرم کی رہو مستحق سدا

## اختر بیگانہ

# بہ تقریب شادی خانہ آبادی عزیزہ صباحت منصور

خوشا بخت گلشن میں آئی بہار
زہے قدرت و شان پروردگار

اٹھی جھوم کے کالی کالی گھٹا
وہ اٹھلائی پھرتی ہے باد صبا

جسے دیکھیے شاد ہی شاد ہے
کہ ناہید کا گھر پری زاد ہے

وہ دیکھے کوئی بھائیوں کی خوشی
صباحت بہن جب دلہن بن گئی

دعا پھوپیاں اس کو دینے لگیں
فدا بھاوجیں اس پہ ہونے لگیں

بلائیں وہ بڑھ بڑھ کے لیتی رہیں
دعائیں سبھی اس کو دیتی رہیں

یہ مہندی یہ سہرا تجھے راس آئے
نہ رنج والم ہو نہ غم پاس آئے

مبارک مبارک یہ رنگین موڑ
یہ دلہا دلہن کی محبت کا جوڑ

امارت کی دنیا مرا گھر نہیں
مرے پاس زر اور زیور نہیں

ہر اک خوش رہے تجھ سے سسرال میں
تو راضی رہے سب سے ہر حال میں

چلی ہے دوارے تو سجنا کے آج
یہ آنسو ہیں انمول بابا کے آج

وہ رخصت ہوئی گھر سے جان بہار
چلی وہ تو روئے سبھی زار زار

دعائیں یہ ماں باپ دینے لگے
سدا خوش رہے تو یہ کہنے لگے

دعا ہے یہ اختر کی پھولو پھلو
سدا اس جہاں میں سہاگن رہو

--------

افسانہ

سید محمد احسن

# آخری سُر

سٹوڈیو میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس وقت صبح کے پانچ بجے تھے اور تمام ورکرز چھٹی لے کر رخصت ہو چکے تھے۔ رات بھر ریکارڈنگ اور مکسنگ کا سلسلہ جاری رہا تھا اور مغربی اوسلو کے اس چھوٹے سے گمنام سٹوڈیو میں جیسے دھڑکن آ گئی تھی۔ مگر اب سوائے ایک سائے کے کوئی شے سانس نہیں لے رہی تھی۔ ساحل نے میز پر سے سر اٹھایا اور بالوں کو پیچھے باندھا۔ گھڑی کی جانب دیکھا۔ بعض لوگوں پر شراب بھی اثر نہیں کرتی۔

گھر جانے کا وقت ہو گیا۔ اس کے دماغ میں ایک بے ساختہ آواز ابھری۔ لیکن پھر اچانک اسے خیال آیا کہ گھر ایک بے معنی سا لفظ لگتا ہے۔ گھر تو وہ بہت پیچھے بہت دور چھوڑ آیا تھا۔ اسلام آباد نامی اس شہر میں۔۔۔ کبھی کبھی اس کے خوابوں میں اسی ہنستی گاتی زندگی کا تصور آتا تھا۔۔۔ اس کے سارے دوست۔۔۔ کچھ رشتہ دار۔۔۔ کچھ عجیب مگر خوبصورت یادیں۔ اسلام آباد بھی عجیب سنسان سا شہر تھا مگر وہاں کے مہکتے ہوئے کیفیز سونی گلیوں، سیدھی سیدھی سڑکوں اور بے رونق بازاروں نے جن گیتوں کو جنم دیا تھا وہ آج بھی اسی طرح مقبول تھے۔ مگر پھر زندگی جیسے ایک بھیانک خواب کا روپ دھار گئی تھی۔ ساحل کا ایک ریپ کیس میں گواہی دینا ہی بہت تھا۔ بھری عدالت میں میاں سمیع اللہ کے کردار کے سیاہ پنے کھول دیئے تھے اس نے۔ سمیع اللہ ملک کی سرگرم مذہبی جماعت کے امیر تھے۔ سفید پوش باریش اور بے داغ۔ اپنی پارٹی کے نام اور کام کی طرح۔ مگر ساحل نے وہ دیکھ لیا تھا جو کسی کو نہیں دیکھنا چاہیئے۔

سمن اس کی بہت اچھی دوست تھی۔ دوست کیا ہم راز ہم خیال بھی اس کے ڈیڈی چھوٹے موٹے بزنس مین تھے اور بلدیاتی انتخابات کے لئے قسمت آزمائی کر رہے تھے۔ ان کے تعلقات عامہ اور وسیع حلقہ احباب کے سبب ان کے جیتنے کے امکانات روشن تھے۔ تبھی سمیع اللہ نے خطرے کی بو پا لی تھی۔ سیاست اس کا کھیل تھا اور وہ بہت پرانا کھلاڑی۔ شیر برداشت نہیں کرتا کہ اس کے علاقے میں کوئی دوسرا شیر قدم رکھے اور

سمیع اللہ کو شکست سے نفرت تھی۔ سالہا سال لگے تھے اسے یہاں تک پہنچنے میں اور آج جب اس کا حق تھا۔ تمام حلقوں میں زوردار کامیابی کے لئے عرصہ دراز سے پلاننگ کی گئی تھی اور آج ایک معمولی سا بلدیاتی امیدوار اس کے لئے ہاتھی کی کھال میں اٹکے کانٹے سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ مگر سمیع اللہ نے آج تک معمولی سی چیز بھی قسمت پر نہ چھوڑی تھی۔ اسے اپنی طاقت پر ناز تھا۔

اسی طاقت کا مظاہرہ سمن کے ڈیڈی اور سمن کو بھی دیکھنا پڑا۔ وہ دوپہر کا وقت تھا اور موسم بڑا اچھا تھا۔ ساون کی پہلی پہلی بدلیاں موتی لٹا رہی تھیں۔ ساحل اپنے پرانے کی (Key) بورڈ پر انگلیاں جمائے ہوئے کسی سوچ میں محو تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا کھڑکی میں سے اندر آتی تو اس کے سیاہ گھنگھریالے بال اڑ کے اس کے شانوں پر بکھر جاتے اور اس کی ہلکی سی ٹی شرٹ میں گدگدی محسوس ہوتی۔ اس دھن کا سولہواں ٹریک ترتیب دینا باقی تھا۔۔۔ پھر اچانک موبائل کی گھنٹی بجی اور وہ چونک گیا۔ جونہی سیٹ کان سے لگایا' اس کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ رونے اور چیخوں کی آواز اور بے ربط سسکیاں۔۔۔ اور وہ بھی سمن کی۔ وہ گاڑی کی طرف لپکا اور پندرہ منٹ میں وہ سمن کی کوٹھی کے سامنے تھا۔ اس نے کبھی اتنی تیز گاڑی نہیں چلائی تھی۔ گیٹ کھلا تھا۔ اور تو اور اندر کا دروازہ بھی کھلا تھا۔ ساحل نے کانپتی ٹانگوں کے ساتھ اوپر کی منزل کا رخ کیا جہاں سے ہلکی ہلکی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ اور ایک بو۔ عجب سی متعفن قسم کی بو' جس نے پورے گھر کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

کچھ سیکنڈ بعد سارا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ کمرے میں ہر جانب خون میں لتھڑی ہوئی شیشے کی کرچیاں اور بجھے ہوئے سگریٹ پھیلے ہوئے تھے۔ تقریباً تمام ڈیکوریشن پیسز چکنا چور ہو چکے تھے۔ صوفے تک درست ترتیب میں نہیں تھے۔ اور کونے میں سمن۔ یا شاید سمن جیسی کوئی بلکتی بے بس اور گھائل چیز۔ سمن سے تیزاب کی بو آ رہی تھی۔ اس کا شفاف بدن نیلوں' زخموں اور جلنے کے نشانوں سے بھر چکا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ساحل نے تخیل کی کھڑکی سے کسی برباد شدہ شہر کو دیکھ لیا ہو۔ اور پھر اس کی نظر سمن کی بھوری آنکھوں پر پڑی جو کبھی جوانی اور شوخی کے آئینے ہوتے تھے۔ مگر آج۔۔۔ یہ اجڑی' اجڑی' سوجی ہوئی آنکھیں۔۔۔ نہیں! یہ سمن کی نہیں ہو سکتیں۔۔۔ "سمن کیا ہوا یہ سب سمن۔۔۔ سمن!" بس وہ اتنی ہی کہہ پایا۔ مگر دم توڑنے سے پہلے سمن بہت کچھ کہہ گئی ٹوٹے پھوٹے لفظوں اور کمزور آنسوؤں کے ساتھ ہی سہی۔۔۔

ساحل کو یہ احساس بھی نہ ہوا کہ جسے وہ ہسپتال پہنچا رہا ہے وہ سمن نہیں اس کا مردہ' کٹا پھٹا جسم ہے۔ نرسیں اسے یہی سمجھاتی رہیں کہ وہ جو کوئی بھی تھی۔ اب نہیں رہی اور ساحل سر جھکائے' بے جان آنکھوں سے

زمین کو گھورتا رہا۔ باہر بارش طوفان میں بدل چکی تھی۔ وہ ہسپتال کے باہر کھڑا ساری رات بھیگتا رہا۔ بارش کی ایک ایک بوند جنگلی ہوا کا ایک ایک طمانچہ۔۔۔ وہ ماضی کو حال سے پیوستہ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ اور سمن۔۔۔ اکٹھے آئس کریم پارلر میں گھنٹوں بیٹھے رہنا۔۔۔ سمن کی پونی باندھنا۔ سمن کو اپریل فول بنانا' سمن کے ساتھ بارش میں باسکٹ بال کھیلنا ریکارڈنگ کے دوران مداخلت پر سمن پر غصہ کرنا۔۔۔ ساحل کو لگا جیسے اس نے اپنی زندگی کا ایک ایک پل سمن کے ساتھ گزارا ہو۔۔۔ وہ اتنے قریب تھے جیسے کہ انہیں کبھی ایک دوسرے کی موجودگی کا احساس ہی نہ ہوا۔۔۔ ان تمام تصویروں کے ساتھ سمن کے خون آلود ٹیڈی بیئر کی تصویر گڈمڈ ہوتی رہی۔

وہ دو دن تک اپنے گھر میں نیم بے ہوش پڑا رہا۔

پھر بالآخر اس نے فیصلہ ہی کر لیا۔ ہاں وہ جائے گا اور گواہی دے گا اور گواہی دے گا عدالت میں۔ سمن اور اس کے ڈیڈی کا قاتل سزا پائے گا۔ مگر کئی دفعہ انسان جو سوچتا ہے وہ حقیقت پر مبنی نہیں ہوتا۔۔۔ کئی سچائیاں' کئی اصلیتیں اسے بعد میں پتہ چلیں۔ گواہی تو اس نے دے دی لیکن اس کے بعد جیسے اس کے سارے سپنے' سارے خواب ایک ایک کر کے بکھرتے گئے۔۔۔ پارٹی کے غنڈوں نے اس پر کئی قاتلانہ حملے کیے۔ دھمکی آمیز خطوط اور فون کالز کا تانتا بندھا رہا۔ اس کا کیرئیر' اس کا میوزک اس کے سارے ارمان اب بے وقعت سے لگنے لگے تھے۔۔۔ ایسے حالات میں جان بچانا اور اپنے ہی وطن سے راہ فرار اختیار کرنا سب سے ضروری ہو گیا تھا۔ عدالت میں سمن کیس کی پیروی کرنے والا ہی نہ رہا تو فائلیں بند اور درندے مکمل طور پر آزاد ہو گئے۔ ملک سے باہر جانا ہرگز آسان نہیں تھا لیکن اب یہی اک راہ تھی۔۔۔ ماضی کی بدروحوں سے نجات حاصل کرنے کی۔

باہر ابھی تک برف گر رہی تھی۔ یہ مارچ کا مہینہ تھا مگر اوسلو کی سردی بے رحم اور سخت گیر ہوتی ہے۔ ایسی سخت دھند اور اندھیرے میں ڈرائیونگ۔۔۔ ساحل کو اس تصور سے ہی کپکپی چھوٹ گئی۔ اسے خیال آیا کہ کل شام تک اسے ایک تھیٹر سین کے لئے بیک گراؤنڈ سکور مکمل کر کے دینا ہے۔ بے دلی کے ساتھ اس نے شیلف میں سے اپنا وہی پرانا کی بورڈ نکالا اور اس پر یونہی خفیف سے انداز میں انگلیاں پھیریں۔ یہ کی بورڈ کسی پرانے دوست کی طرح تھا۔۔۔ اس اجنبی شہر میں تنہا ساحل اسی سے باتیں کیا کرتا۔۔۔ اپنے دل کے حال کو سروں میں مقید کرنا' اپنے غم کو آرکیسٹرا کے چڑھتے' اترتے سروں سے ظاہر کرنا۔۔۔ یہی ایک میوزیشن کی

زندگی اور اس کی روزی ہے۔

''کیا ہو رہا ہے جناب ساحل؟'' وہ چونک گیا۔ دروازے میں مارینا کھڑی تھی۔

''مارینا تم؟ اس وقت؟'' ساحل نے بہکی ہوئی آواز میں سوال کیا۔ مارینا مسکرا دی اس کا تعلق فرانس سے تھا مگر وہ ناروے میں بطور ساؤنڈ ٹیکنیشن نوکری کر رہی تھی۔

''شاید تم بھول رہے ہو کہ آج میری چھٹی نہیں ہوتی'' اس نے نارویجن میں کہا'' ٹھیک ہے میں چلتا ہوں''

''نہیں رکو میرے ہاتھ کے بنے کوکیز اور گرما گرم کافی کے بغیر تم کہیں نہیں جا رہے'' ساحل نے مڑ کر دیکھا۔ وہ ہاتھ میں ٹرے اور کھلتے ہوئے لبوں سے ساحل کو دیکھ رہی تھی۔

''مارینا۔۔۔تم بھی نہ کبھی کبھی۔۔۔اس کی کیا ضرورت تھی۔۔۔بعض دفعہ مجھے خود پر غصہ آتا ہے کہ میں تمہاری محبت کا جواب محبت سے نہیں دے پاتا۔ تم نہیں سمجھو گی۔۔۔میرے اندر ایک بھیانک خلاء ہے جو میں کسی کے ساتھ نہیں بانٹنا چاہتا۔۔۔کسی کے ساتھ بھی نہیں''

''جانتی ہوں میں'' اس نے ٹرے رکھتے ہوئے کہا۔''ہم لوگ اکثر تصور کرتے ہیں کہ جتنی مشکلات ہم نے سہی ہیں انہیں کوئی دوسرا نہیں سمجھ سکتا لیکن اس دنیا میں غم کے ماروں کی کمی نہیں'' وہ اپنی مخروطی انگلیوں سے ساحل کے لمبے الجھے بال سنوارنے لگی۔

مارینا کی داستان ساحل کے اندازے سے بڑھ کر دردناک تھی۔ مارینا نے اپنی عمر کے بمشکل پچیس سالوں میں اپنے باپ' بھائی اور پھر اپنے بوائے فرینڈ کو ناگہانی موت مرتے دیکھا تھا۔ اس پر اپنے بوائے فرینڈ کے قتل کا الزام تھا۔ گو عدالت نے اسے باعزت بری کر دیا تھا مگر رشتہ داروں اور خاندان والوں نے اسے اپنانے سے انکار کر دیا تھا۔ ایک مشہور ساؤنڈ کمپنی میں ملازمت اسے ناروے کھینچ لائی تھی۔

''میں بہت چھوٹی تھی' تب میں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ پرانی یادیں اور خاص طور پر تکلیف دہ یادیں اور تجربات خالی ڈبوں اور بوتلوں کی طرح ہوتے ہیں۔ انہیں ڈسٹ بن میں پھینک دینا چاہیے'' مارینا اس وقت اپنی عمر سے بہت بڑی لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں چھپے درد امڈ کے باہر آ رہے تھے۔ سٹوڈیو کی دھیمی روشنی میں وہ بے حد پرکشش لگ رہی تھی۔ ساحل نے نرمی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

''مارینا میری ایک دھن سنو گی؟ یہ کبھی کسی کے وجود سے وابستہ تھی مگر آج یہ تمہارے نام سہی''

ساحل نے غیر متوقع جوش کے ساتھ کہا اس کی انگلیاں کی بورڈ کو چھیڑنے لگیں۔ سُر سناٹے کو چیرتے ہوئے دیواروں سے ٹکرانے لگے اور یوں محسوس ہوا جیسے سٹوڈیو میں زندگی پھر سے رقصاں ہو۔

''زبردست ساحل زبردست۔ اس نغمے کو ذرا مارکیٹ میں آنے دو پھر دیکھو تمہارا غم کتنے لوگ خریدتے ہیں۔'' مارینا کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جیسے کسی چھ سال کی بچی نے جھاڑیوں میں چھپے خرگوش کو دیکھ لیا ہو۔

''باہر برفباری رک گئی ہے۔ چلو کسی ریسٹورنٹ میں جا کر ناشتہ کرلیں مجھے بھوک لگ آئی ہے'' ساحل نے ہنستے ہوئے کہا۔

باہر گلابی رنگ کا سورج پھیکی پھیکی دھوپ بکھیر رہا تھا۔ سڑک پر زندگی کے ہنگامے شروع ہو رہے تھے۔ اور یکایک ساحل کو لگا جیسے واقعی طوفان ختم ہو گیا ہو اور اسے پھر سے زندگی مل گئی ہو۔

آج معمول کی طرح ایک سایہ سٹوڈیو کے گیٹ سے باہر نکلا۔ لیکن وہ اکیلا نہیں تھا۔ اسے ایک اور سائے کا ساتھ مل گیا تھا۔

---

## پروفیسر سید محبوب علی زیدی

# قطعہء تہنیت

(بتقریب سعید شادی خانہ آبادی عزیزہ ڈاکٹر سید صباحت منصور منعقدہ ۴ مئی ۲۰۰۳ء)

صباحت نے صمد کو اور صمد نے نام رب پایا   خدا اپنی ہی رحمت کا رکھے ان پر سدا سایا
مسرت اور محبت ہمرکاب ان کے ہمیشہ ہوں   دعا دیتا' مبارک کہتا' ہر کوئی آیا

شہلا احمد

# کھیوڑہ سالٹ مائنز کا یادگار تعلیمی و تفریحی دورہ

الاقرباء فاؤنڈیشن وقتاً فوقتاً اپنے اراکین کیلئے خوبصورت اور دلچسپ پروگراموں کا اہتمام کرتی رہتی ہے۔ یہ پروگرام کبھی معلوماتی و تعلیمی شکل میں ہوتے ہیں تو کبھی پکنک پارٹیز کا رنگ لئے ہوئے۔ کبھی کوئی قومی دن پوری آن بان اور شان سے منایا جا رہا ہوتا ہے تو کبھی روح کی بالیدگی کیلئے دینی محافل سجائی جاتی ہیں۔ کبھی مجلس عمومی کے سالانہ اجلاس کے ساتھ ثقافتی پروگرام کا اہتمام کر کے تفریح طبع کا سامان کیا جاتا ہے۔ تو کبھی ''اسپورٹس ڈے'' منا کر بچوں' بڑوں اور نوجوانوں کی ذہنی و جسمانی نشوونما کی جاتی ہے۔ اور کبھی مینا بازار کے ذریعے تنظیم کے مالی وسائل میں اضافہ کر کے رفاہی و فلاحی کاموں کا دائرہ وسیع کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تاہم بنیادی مقصد ان سب صورتوں کا رکن عزیز و اقارب کو فرصت کے کچھ لمحات فراہم کر کے خوشیاں اور مسرتیں بانٹنا اور ان کے درمیان اخوت و یک جہتی پیدا کرنا ہے۔

گزشتہ دنوں ملکی اور بین الاقوامی غیر یقینی و پریشان کن صورت حال کی بنا پر اراکین کئی دلچسپ اور معلوماتی پروگراموں سے لطف اندوز نہ ہو سکے لیکن جیسے ہی فضا بہتر ہوئی فاؤنڈیشن نے پکنک کا پروگرام بنا ڈالا کہ یہ کافی عرصہ سے کسی نہ کسی وجہ سے التواء کا شکار چلا آ رہا ہے۔ لیکن کھیوڑہ سالٹ رینج پر پکنک کا آئیڈیا سب کو پسند آیا کہ یہ جگہ ''تعلیم و تفریح'' دونوں مقاصد پورے کرتی تھی۔ لہٰذا اس کو حتمی شکل دے دی گئی۔ اتوار مورخہ ۱۳ اپریل ۲۰۰۳ء پکنک کیلئے متعین ہوا۔ اس سلسلے میں جناب جی اے صابری نے ریسٹ ہاؤس کی مقررہ تاریخ پر پکنک سے لے کر کھیوڑہ مائنز کی سیر تک کے جملہ انتظامات کی ذمہ داری رضاکارانہ طور پر سنبھال لی۔ جبکہ فاؤنڈیشن کے تمام اراکین کو اس دورے کے بارے میں معہ دیگر تفصیلات اطلاعی خطوط ارسال کرنے کی ذمہ داری حسب معمول سیکرٹری جنرل نعیم احمد کے سپرد ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے مقررہ تاریخ سے کافی پہلے تمام اراکین کو اس پروگرام میں شرکت کے خطوط معہ جملہ ضروری تفصیلات' اس تاکید کے ساتھ پوسٹ کر دیئے کہ شرکاء اپنی ٹرانسپورٹ میں شاہراہ اسلام آباد پر واقع سہالہ پل پر اتوار ۱۳ اپریل کی صبح ساڑھے آٹھ سے نو بجے کے

درمیان مکمل پابندی وقت کے ساتھ پہنچ جائیں۔ تا کہ وہاں سے یہ کارواں ٹھیک نو بجے منزل مقصود کیلئے روانہ ہوجائے۔

غار کا ایک منظر

سالٹ رینج یوں تو دریائے جہلم کے مشرقی و مغربی علاقہ سے لے کر دریائے سندھ پر واقع کالا باغ تک پھیلی ہوئی ہے۔ لیکن کھیوڑہ مائنز اس کا خاص مرکز ہیں کیونکہ یہاں دنیا کی سب سے بڑی نمک کی کانیں ہیں۔ کھیوڑہ سالٹ مائنز راولپنڈی سے ۱۵۴ کلومیٹر جبکہ اسلام آباد سے ۲۰۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ہیں۔ جی ٹی روڈ سے یہاں پہنچنے کیلئے ہمیں مندرہ ۔ڈھڈیال۔ چکوال۔ چوا سیدن شاہ اور کھیوڑہ سے گزرنا ہوتا ہے۔ کھیوڑہ یوں تو ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ لیکن یہ نمک کے وسیع ذخائر کی وجہ سے دنیا بھر میں ایک خاص اہمیت و شہرت رکھتا ہے۔ یہاں سیاحوں اور اسکول و کالج کے طلباء و طالبات کے علاوہ عام پبلک کی ایک بڑی تعداد سیر کیلئے آتی ہے۔ نمک کا انمول خزانہ اور کانوں کی بھول بھلیاں یہاں آنے والوں کو جہاں خوش کرتی ہیں وہاں حیرت زدہ بھی کرتی ہیں۔ کھیوڑہ کا پورا راستہ پتھریلی چٹانوں، چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں اور گہرے کھڈوں پر مشتمل ہے۔ یہاں کے پہاڑ زیادہ تر خشک اور زمین نا قابل کاشت ہے۔ کانوں تک پیدل کے علاوہ ریل کے ذریعے بھی پہنچا جا سکتا ہے۔ انگریزی دور حکومت میں یہاں کافی ترقیاتی کام ہوئے۔ ۱۸۸۶ء میں چک نظام کے مقام پر پل تعمیر کر کے علاقہ کو ریل کے ذریعے ملک وال سے ملا دیا گیا۔ جس سے کاریگروں کو کام پر آمد و رفت میں بڑی آسانی ہوگئی۔ دوسرے اس سہولت کی وجہ سے پورے برصغیر میں نمک کی ترسیل شروع ہوگئی۔ یہاں تک کہ ۱۸۹۰ء میں نمک پورے برصغیر میں پھیل گیا۔ نمک کی نکاسی کو فروغ بھی برطانوی عہد میں ہی حاصل ہوا۔ اور اسی دور میں کانوں کی حفاظت اور مزدوروں کے تحفظ کیلئے

متعدد اقدامات کیئے گے۔ یہاں پہاڑ کے ایک جانب رہائشی علاقہ ہے۔ جہاں اسکول' کالج' پوسٹ آفس' ریسٹ ہاؤس اور پی ایم ڈی سی کے دفاتر ہیں۔ گول بازار یہاں کا سب سے بڑا بازار ہے۔ اس کے علاوہ ایک گرجا گھر اور انگریزی دور حکومت کی عمارتیں ہیں جو انگریزی طرز تعمیر کا نمونہ پیش کرتی ہیں۔ یہاں کے رہنے والے زیادہ تر نمک کی نکاسی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور صدیوں سے ان کا یہ ہی پیشہ ہے۔ جو نسل در نسل منتقل ہو رہا ہے۔

کھیوڑہ مائنز سے حاصل شدہ نمک پیداوار کے لحاظ سے پہلے نمبر پر ہے جبکہ رقبہ کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر ہے۔ یہاں سے حاصل شدہ نمک ۹۸ فیصد خالص ہے۔ جو ملکی ضروریات پوری کرنے کے علاوہ بیرون ملک بھی برآمد کیا جاتا ہے۔ اور یوں زرمبادلہ حاصل ہوتا ہے۔ کانوں سے نمک بڑی مہارت سے سائنسی اور تکنیکی اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے نکالا جاتا ہے۔ کہ اس کام میں ذرا سی بے احتیاطی کان کو بے کار اور کان کنوں کی زندگی ختم کر سکتی ہے۔ کانوں میں کام کرنے کیلئے مختلف منزلیں ہیں۔ جن میں چار منزلیں سطح زمین کے اوپر جبکہ گیارہ اس کی سطح سے نیچے ہیں۔ اس طرح کان سے ۱۶ مقامات پر نمک کی نکاسی کی جاتی ہے۔ ہر سرنگ سے ۴۰ سے ۵۰ فٹ تک نمک نکال کر بقیہ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ جو پہاڑ کیلئے ستونوں کا کام دیتا ہے اور یوں سرنگوں پر سرنگیں اور ستونوں پر ستون ایستادہ ہونے سے کان محفوظ رہتی ہے۔ نمک نکالنے سے کان میں تقریباً اسی ۸۰ وسیع و عریض کمرے بن گئے ہیں دوسری طرف راہداریوں کے ارد گرد پانی کے ساٹھ ستر کے قریب پینتیس سے اسی فٹ گہرے تالاب ہیں اور یہ تمام تالاب پہاڑ سے رس رس کر اندر آنے والے پانی سے وجود میں آئے ہیں۔ ان میں ایک تالاب تو ۲۲۰ فٹ لمبا ۷۰ فٹ چوڑا اور ۸۰ فٹ گہرا ہے۔ اسے بحر الکاہل

نمک کے کرسٹل سے بنا ہوا ایک خوبصورت فانوس

کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ یہ ہی نمکین پانی پائپوں کے ذریعے باہر نکالا جاتا ہے۔ یہ پانی دراصل کئی کیمیائی اجزاء سے مالا مال ہوتا ہے۔ جس کو برائن سلوشن کہتے ہیں۔ یہ کپڑے دھونے والے سوڈے سمیت بہت سی دوسری کیمیائی اشیاء کی تیاری میں استعمال ہوتا ہے۔

غار کے اندر بنی ہوئی جھالریں

ICI نے تو کھیوڑہ میں باقاعدہ ایک یارڈ بنا رکھا ہے۔ یہاں سے برائن سلوشن کمپنی کے کارخانوں میں پہنچتا ہے۔ وہاں اس سے اور بہت سے محلول تیار کر کے مہنگے داموں فروخت کئے جاتے ہیں۔ یہ کمپنی نمک کی سب سے بڑی خریدار ہے اور کھیوڑہ کا تقریباً تین چوتھائی نمک یہ خرید لیتی ہے۔ جبکہ یہ نمکین پانی بالکل مفت (جس کی مقدار سالانہ دو سے تین لاکھ ٹن ہوتی ہے) حاصل کر کے بے شمار دولت کماتی ہے۔ کئی اور صنعتیں بھی نمک کی پیداوار سے منسلک ہیں جن میں چمڑہ صاف کرنے، کپڑا رنگنے اور سوڈا کاسٹک کی صنعتیں قابل ذکر ہیں۔ جبکہ اس کی اہمیت غذائی اور طبی لحاظ سے بھی بہت ہے۔ نمک کا یہ خزانہ اتنی بڑی مقدار میں ہے کہ صدیوں تک نکالا جائے تو بھی ختم نہ ہو۔ اسی بات کو محسوس کرتے ہوئے برطانوی حکومت نے تمام دوسری جگہوں سے کان کن افراد کو لا کر کھیوڑہ میں آباد کر دیا۔ جو صرف یہیں سے نمک نکالتے تھے۔ بقیہ تمام کانوں پر نمک کی نکاسی بند کر دی گئی تھی لیکن اب جبکہ سالٹ رینج کا نظم و نسق پی ایم ڈی سی کے ہاتھ میں ہے۔ کھیوڑہ کے علاوہ دوسری کانوں سے بھی نکاسی نمک شروع ہو گئی ہے۔

ہاں تو جب پروگرام ۱۳ اپریل بروز اتوار صبح تقریباً سب ہی شرکاء اپنی اپنی گاڑیوں میں سہالہ پل پر

وقت مقررہ پر پہنچ گئے۔ گاڑیوں سے اتر کر سب نے ایک دوسرے سے علیک سلیک کرتے ہوئے خیر و عافیت دریافت کی۔ موسم قدرے گرم ہونے کے باوجود سب خوش و خرم اور پر جوش نظر آ رہے تھے۔ بچوں کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ بھاگ بھاگ کر ایک دوسرے سے مل رہے تھے۔

لمبے سفر کے بعد تھکے ہارے لوگ

تقریباً سوا نو بجے منصور بھائی نے نعیم احمد کو روانگی کا سگنل دیا۔ سب جلدی جلدی گاڑیوں میں بیٹھ گئے۔ ابھی گاڑیوں نے حرکت نہیں کی تھی کہ اطہر کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف علی بھائی تھے۔ انہوں نے کہا کہ انہیں سہالہ پل پر پہنچنے میں دقت کا سامنا ہے۔ چنانچہ انہیں راستہ سمجھا دیں۔ نعیم اور اطہر نے ان کی راہنمائی کرتے ہوئے جلدی پہنچنے کی تاکید کی۔ اتنی دیر میں اطہر گاڑی میں پٹرول ڈلوانے کیلئے آگے بڑھ گئے اور وہیں پر سب کا انتظار کرنے کا کہہ گئے۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ آفتاب بھائی وظفر بھائی بمعہ اپنے اہل خانہ و چند مہمانان گرامی وہاں سب کا انتظار کر رہے ہیں۔ خاص طور پر نیئر بڑی بے قراری سے میری منتظر تھیں۔ آخر ان کو اپنی کھیر سمیت میری گاڑی میں بیٹھنا تھا۔ لیکن عین وقت پر انہوں نے وعدہ خلافی کی اور کھیر میرے حوالے کر کے جا بیٹھیں دوبارہ اپنی گاڑی میں کہ انکے بغیر ان کے مہمان جو بور ہوتے۔ مہمان تو بہر حال سب کے سانجھے ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کا خیال کرتے ہوئے چپ ہونا پڑا۔ ورنہ تو اس چالاکی پر میں نیر کو کبھی نہ بخشتی۔۔ آپ حیران ہو رہے ہوں گے کہ یہ کھیر کا کیا چکر ہے۔ تو جناب۔ بات یہ ہے کہ کھیوڑہ میں پکنک منانے کا قطعی یہ مطلب نہیں ہے کہ وہاں صرف نمک پر اکتفا کیا جائے گا۔ آخر وہاں پہنچ کر کچھ کھانا پینا بھی تو تھا۔ اور اتنی

صبح کوئی پکوان سنٹر ہمیں کھانا تیار کر کے نہیں دے سکتا تھا۔ لہٰذا ''اپنی مدد آپ'' کے اصول پر عمل کرتے ہوئے کچھ خواتین نے ایک ایک ڈش تیار کرنے کا ذمہ لے لیا۔ ناہید بھابی چونکہ نہاری بڑے مزے کی بناتی ہیں۔ سو یہ ڈش ان کے سپرد ہوئی۔ لذیذ چکن قورمہ لبنیٰ سالاری نے تیاری کیا۔ جبکہ کھیر میرے اور تیر کے حصے میں آئی۔ نرم نرم مزیدار نان آفتاب بھائی کو سونپے گئے کہ وہ اس کام میں بڑی مہارت و تجربہ رکھتے ہیں۔ اور گرما گرم مزیدار چائے کے ماہر۔ تو۔ ہیں ہی میاں نعیم۔۔ سو وہ ان سے پوچھے بناء ہی ان کے سپرد کر دی گئی۔۔!

تقریباً دس بج رہے تھے۔ سورج میاں کچھ اور اوپر آ گئے تھے۔ دھوپ کی تپش میں اضافہ کے ساتھ گرمی کی شدت بھی بڑھنے لگی تھی لہٰذا سب دوبارہ گاڑیوں میں بیٹھ گئے۔ اور بے چینی سے شیخ صاحب اور فیملی کا انتظار کرنے لگے۔ اللہ اللہ کر کے ان کی گاڑی نظر آئی تو سب نے سکھ کا سانس لیا۔ اور اشارہ پاتے ہی دس بارہ گاڑیوں پر مشتمل یہ قافلہ براستہ جی ٹی روڈ اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ نعیم میاں کی گاڑی سب سے آگے رہنمائی کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ بقیہ گاڑیاں ان کے اشاروں پر آگے بڑھ رہی تھیں۔ گرمی کے باوجود یہ قافلہ ہنستا مسکراتا گاڑیوں میں لگے میوزک سے لطف اندوز ہوتا منزل کی طرف رواں دواں تھا کہ چکوال ٹرمنل پر آرمی چیک پوسٹ سے گاڑیوں کو رکنے کا اشارہ ملا۔ تمام گاڑیاں آہستہ آہستہ رک گئیں۔ چیک پوسٹ سے سفید وردی میں ملبوس پی کیپ لگائے دو خوبرو نوجوان باری باری تمام گاڑیوں کے قریب آئے اور نہایت مودبانہ انداز میں کھڑکی میں جھکتے ہوئے پیغام دیا کہ جناب آپ چکوال روڈ پر اپنی گاڑیوں کی اسپیڈ کم رکھیں اور ایک دوسرے کو کراس کرنے کی کوشش نہ کریں کیونکہ تمام راستہ راڈار کی زد میں ہے اور ہر گزرنے والی گاڑی کی

ستانے کا ایک انداز

چیکنگ ہو رہی ہے۔ کوئی بھی غلط قدم آپ کو گرفت میں لے سکتا ہے۔ اور ایک ہزار روپے تک آپ پر جرمانہ کیا جاسکتا ہے چنانچہ سب محتاط ہو گئے اور نہایت احتیاط سے سب نے چکوال روڈ پر اپنی گاڑیاں موڑ لیں۔ نعیم اور اطہر نے اپنی گاڑیاں موڑ کر ذرا آگے کھڑی کر لیں تاکہ ہر گاڑی پر نظر رکھی جاسکے کہ اتنے میں شیخ صاحب کی گاڑی چکوال موڑ مڑنے کے بجائے تیزی سے آگے نکل گئی۔ ان لوگوں کیلئے پھر ایک پریشانی کھڑی ہو گئی۔ انہوں نے موبائل پر رابطہ کی کوشش کی تو وہ بند تھا۔ اب سوائے انتظار کے کوئی چارہ نہ تھا۔ کافی آگے جا کر انہیں خود احساس ہوا کہ اس راستے پر وہ اکیلے ہی جارہے ہیں۔ تو انہوں نے موبائل آن کر کے ان لوگوں سے رابطہ کیا۔ انہیں ان کی غلطی کا احساس دلاتے ہوئے واپسی کی سمت سمجھائی۔ تب کہیں جا کر وہ واپس ہم سب کے پاس پہنچے۔ اس چکر میں ۲۰ منٹ اور ضائع ہو گئے۔ اب نعیم احمد نے اپنی گاڑی سب سے پیچھے رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اور یوں یہ قافلہ مزید کسی مسئلے میں الجھنے۔ منزل کی طرف روانہ ہوا۔

کھیوڑہ مائنیز کا ایک بیرونی منظر

پتھریلی اور ناہموار سڑک پر گاڑیاں ہچکولے کھاتی آگے ہی آگے بڑھتی چلی جارہی تھیں۔ سڑک کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اور کہیں گہرے کھڈ تھے۔ نوجوان اور بچے شوخیاں کرنے اور ہنسی مذاق میں مصروف تھے۔ جب کوئی گاڑی کسی گاڑی سے آگے نکل جاتی تو ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہ ہوتا۔ غرض یہ کہ ایک دوسرے پر پھبتیاں کستے، ہنستے مسکراتے۔ گرمی کی شدت اور راستے کی دشواری سے بے نیاز ہو کر یہ سب پروگرام کو خوبصورت و پرلطف بنا رہے تھے۔ تقریباً ایک گھنٹے میں ہم مندرہ اور ڈھڈیال کو پیچھے چھوڑ کر چکوال

بشاش چہرے لیکن چائے کا انتظار

پہنچے۔ سامنے ہی بڑے سے سائن بورڈ پر "خوش آمدید چکوال" پڑھ کر سب نے خوشی کا اظہار کیا۔ یہیں پر دائیں طرف جاتی ہوئی ایک سڑک کے کونے پر سی این جی فلنگ اسٹیشن لکھا دیکھ کر گیس پر چلنے والی گاڑیوں نے گیس بھروانے کا ارادہ کرلیا اور دائیں طرف سڑک پر مڑ گئیں۔ گیس اسٹیشن کافی اندر جا کر تھا دوسرے وہاں رش بھی تھا۔ چنانچہ یہاں بھی تقریباً بیس پچیس منٹ لگ گئے۔ بقیہ گاڑیاں وہیں کھڑی ہوگئیں۔ موقع غنیمت جان کر لوگ گاڑیوں سے باہر نکل کر کولڈ ڈرنکس اور پانی سے شغل کرنے لگے۔ گیس بھروا کر گاڑیاں واپس آئیں تو یہ قافلہ ایک بار پھر اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔

چکوال نسبتاً سبز ہے۔ یہاں سڑک کے دونوں طرف سایہ دار درخت ہیں۔ سڑک کے دونوں طرف تاحد نگاہ گندم کے وسیع و عریض کھیت تھے۔ گندم کی فصل پک کر تیار ہو چکی تھی۔ بڑا خوبصورت منظر تھا۔ یہاں سے وہاں تک گندم کی سنہری چادر بچھی ہوئی تھی۔ کہیں کہیں فصل کٹ کر ڈھیریوں کی شکل میں پڑی منڈیوں میں جانے کی منتظر تھی جبکہ کئی کھیتوں میں نرم و نازک سنہری سی بالیاں سر اٹھائے اپنی باری کا انتظار کر رہی تھیں۔ کچھ خالی کھیتوں میں گائے بھینس اور بکریاں بچی کچی فصل سے اپنا پیٹ بھرنے میں مشغول تھیں۔ اور انہیں کھیتوں میں گاؤں کے مرد اور عورتیں رنگ برنگے دیہاتی کپڑوں میں ملبوس گرمی کی تمازت سے بے نیاز سر جھکائے اپنے کام میں مصروف تھے۔ دور پہاڑوں کے دامن میں ان کے گاؤں تھے جہاں کثرت سے پھلوں کے باغات، موسمی سبزیاں اور خوبصورت پھلواریاں ان کے حسن کو دوبالا کر رہی تھیں۔

آ گے جا کر چکوال شہر تھا۔ جہاں کئی بڑے بازار تھے جہاں ہر قسم کا سامان موجود تھا۔ لوگوں کی کثیر تعداد وہاں خرید و فروخت کر رہی تھی۔ اور ایک میلہ کا سا سماں تھا۔

چکوال سے جب ہمارا قافلہ چواسیدن شاہ پہنچا تو ہمارے سامنے ایک بالکل ہی مختلف منظر تھا۔ کھیوڑہ سے ذرا پہلے چڑھائی شروع ہوگئی۔ ہم سب نے اپنی گاڑیاں پہاڑ کے ساتھ ساتھ گولائی میں اوپر چڑھتی ہوئی سڑک پر ڈال دیں۔ منٹوں میں ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں ایک طرف ڈھلوان نما گہری کھائی تھی۔ دوسری طرف پہاڑ۔ سڑک پر چڑھتے ہوئے ہم سطح سمندر سے تقریباً دو ہزار ۲۰۰۰ فٹ کی بلندی پر پہنچ گئے۔ جس کے دامن میں کھیوڑہ ایک خوبصورت فوجی چھاؤنی کا منظر پیش کرتا نظر آ رہا تھا۔ تقریباً ۲۴ کلومیٹر کا سفر طے کرتے ہوئے ہم چواسیدن شاہ کی ذرخیز وادی میں داخل ہوئے۔ راستے میں اتنے دلکش و دل فریب مناظر تھے کہ بے ساختہ زبان سے سبحان اللہ نکل جاتا اور ہر سین کو ہمیشہ کیلئے آنکھوں میں سمونے کو دل چاہنے لگتا۔ میں تو پلک جھپکائے بغیر ان مسحور کن نظاروں کو دیکھے جا رہی تھی۔

ں شہر کا نام مشہور و معروف صوفی بزرگ سیدن شاہ کے نام پر رکھا گیا ہے۔ چواسیدن شاہ کے معنیٰ "سیدن شاہ کا چشمہ" ہے۔ یہ نہایت سر سبز و شاداب ہے۔ اور یہاں کثیر تعداد میں پھلوں کے باغات ہیں۔ جن کی آبیاری یہاں کے چشموں سے کی جاتی ہے۔ گھنے سر سبز و سایہ دار درختوں والی شاہراہ پر ان بزرگ کا مزار ہے۔ ان کے کیلئے مشہور ہے کہ سیدن شاہ کے ٹھنڈے میٹھے پانی کے چشمے ان بزرگ کی زاہدانہ کرامات کا نتیجہ ہیں۔ چواسیدن شاہ کی سب سے اہم و خاص اور قابل دید چیز کتاس کمپلیکس Complex of

کان کے اندر نمک کا ایک روشن ڈھیر

Ketas ہے جس کے معنی ''آنسو بہاتی آنکھیں'' ہے۔

چواسیدن شاہ سے گزر کر ہم ایک نسبتاً کم چوڑی سڑک پر پہنچے تو ہمیں اپنی دائیں طرف اترائی پر کھیوڑہ کا جدید طرز کا شہر نظر آیا۔ یہ تقریباً پچاس سال پہلے معرض وجود میں آیا۔ اور یہ ہی سالٹ رینج کا اہم مرکز ہے۔ یہاں نمک کی سب سے بڑی کان ہے۔ یہاں زیادہ تر نمک کی کان میں کام کرنے والے مزدوروں کی رہائش ہے۔ یہاں کئی ریسٹ ہاؤس ہیں۔ جن کا نظم ونسق پاکستان مائنز ڈیولپمنٹ کارپوریشن کے سپرد ہے۔ ہم صاف وشفاف سرمئی سڑک پر نیچے اترتے چلے گئے دن کے تقریباً ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ سورج عین ہمارے سروں پر پوری آب وتاب سے چمک رہا تھا۔ اس کی شعلہ بار کرنیں زمین پر آگ برسا رہی تھیں۔ اس وقت صرف دل یہی چاہ رہا تھا کہ جلدی سے کہیں جائے پناہ مل جائے۔ چاہے وہ سایہ دیوار ہی کیوں نہ ہو۔

بچے پکنک کے موڈ میں

سڑک پر دائیں طرف ملٹی نیشنل کمپنی کے بڑے بڑے یارڈ نظر آرہے تھے جس میں برائن سلوشن (نمکین پانی) اسٹور کیا جاتا ہے۔۔ ہماری گاڑیاں ایک دوسرے کے پیچھے ایک قطار میں آگے بڑھ رہی تھیں کہ اچانک ہماری نظر بائیں طرف بنے ہوئے ریسٹ ہاؤسز کی چاردیواری پر پڑی۔ سب کے چہروں پر سکون واطمینان کی ایک لہر دوڑ گئی۔ نعیم میاں کی رہنمائی میں تمام گاڑیاں بڑے سے گیٹ کے اندر داخل ہوگئیں۔ اور مناسب جگہ جہاں تھوڑا سا سایہ بھی ہو دیکھ کر سب نے اپنی اپنی گاڑیاں پارک کر دیں۔

گاڑیوں سے اترتے ہی احساس ہوا کہ منصور بھائی کی گاڑی تو ابھی پہنچی ہی نہیں ہے۔ نعیم اور دوسرے لوگ جلدی سے باہر نکلے کہ دیکھیں بھائی صاحب کہاں ہیں۔ اور۔ ابھی نظریں ادھر ادھر دوڑا ہی رہے

اب تو کھانے کا بلاوا آہی جانا چاہئے

تھے کہ سامنے سے گاڑیاں آتی ہوئی دکھائی دی۔ سب نے سکھ کا سانس لیا۔ بھائی صاحب کے آتے ہی نعیم میاں نے سامنے والے ریسٹ ہاؤس کی عمارت کے چوکیدار کو بتایا کہ ہم اسلام آباد سے آئے ہیں اور یہاں ہماری بکنگ ہے۔ چوکیدار نے بتایا جی یہاں تو آرمی میڈیکل کالج کے طلباء واساتذہ مقیم ہیں۔ یہ تو آپ کو نہیں مل سکتا۔ اتنے میں منصور بھائی وہاں پہنچ گئے اور چوکیدار سے کہا کہ اپنے انچارج کو بلاؤ۔ ان کے آنے پر بکنگ کے بارے میں بتایا تو ان صاحب نے دوسری عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ آپ لوگ وہاں قیام کیجئے۔ وہ بھی اسی ریسٹ ہاؤس کا حصہ ہے۔ چنانچہ ہم سب ایک بار پھر گاڑیوں میں بیٹھے اور عقبی حصہ کی طرف کوچ کیا۔ وہاں پہنچ کر بیرونی لان اور صحن میں تمام گاڑیاں لائن سے کھڑی کردی گئیں۔ سامنے ہی نسبتاً چھوٹی عمارت تھی سب نے اپنی گاڑیوں سے سامان نکالا اور اندر داخل ہو گئے۔ یہ ایک بیڈ روم ایک کشادہ ڈرائنگ روم ڈائننگ روم کچن اور پنٹری پر مشتمل عمارت ہے۔ غسل خانہ بھی صاف ستھرہ اور کشادہ ہے۔ ہر کمرے میں اس کی ضرورت کے مطابق فرنیچر ہے۔ سامنے ایک کشادہ برآمدہ ہے۔ تمام خواتین نے بیڈ روم کا رخ کیا تاکہ اپنے سراپا پر ایک نظر ڈالیں۔ آخر شدید گرم موسم میں ساڑھے تین گھنٹے کے سفر کا چہروں پر اثر تو ہونا ہی تھا۔ سو ٹھنڈے پانی کے چھینٹوں نے اکسیر کا کام کیا۔ اور چہرے پھر سے تروتازہ ہو گئے۔ مرد حضرات نے ڈرائنگ روم میں نشستیں سنبھال لیں۔ اور اپنے پسندیدہ موضوعات پر گفتگو کرنے کے ساتھ ساتھ منہ ہاتھ دھوکر پھر سے تازہ دم ہو گئے۔ محمد علی صدیقی صاحب کا عربی حقہ حسب معمول ان کے ساتھ تھا۔ اور سب کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔

نوجوانوں نے اپنی محفل الگ سجائی ہوئی تھی۔ اور بچے بھلاوہ کیوں کسی سے پیچھے رہتے۔ گاڑیوں سے اترتے ہی ہوگئے مشغول وہ۔ اپنے پسندیدہ کام۔ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگنے دوڑنے اور کھیل کود میں۔ ان تتلیوں کو تو نہ گرمی لگتی ہے نہ سردی۔ موسموں کے اتار چڑھاؤ سے بے غم و بے نیاز انہیں تو بس اپنی ہی کرنی ہوتی ہے۔

ٹائم چونکہ زیادہ ہو چکا تھا۔ لہٰذا متفقہ فیصلہ یہ ہوا کہ پہلے کھانے اور نماز وغیرہ سے فارغ ہولیا جائے۔ پھر کانوں کی سیر کو جایا جائے۔ تاکہ واپسی وہیں سے ہو جائے۔۔۔ چنانچہ کھانے کے انتظامات شروع ہوگئے۔ کھانے کے برتن وہاں موجود بڑی سی ڈائننگ ٹیبل پر سیٹ کر دیئے گئے۔ دوسری طرف ٹھنڈے پانی کے کولر رکھ دیئے گئے۔ نہاری اور چکن قورمہ گرم ہوتے ہی نعیم احمد نے اپنی ڈیوٹی سنبھال لی۔ اور ڈونگوں میں سالن نکالنا شروع کر دیا۔ جبکہ سارہ، مریم، عائشہ صباحت اور دوسری بچیوں نے ڈونگے میز پر لا کر رکھ دیئے۔ سلمان اور فرحان بھی دوڑ دوڑ کر اس کام میں مدد کر رہے تھے۔ طیبہ بھابی نے نان کے خوان پوش کھول دیئے۔ بیچ میں کھیر کی پتیلیاں سج گئیں۔ تو سب کو کھانے کی دعوت دی گئی۔

نہاری اور چکن قورمہ کی خوشبو نے سب کی بھوک چمکا دی۔ آواز لگتے ہی سب نے میز پر دھاوا بول دیا۔ لذیذ قورمہ اور مزیدار نہاری کے ساتھ نرم نرم نان۔ سب نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ اور خوب خوب تعریف کی۔ نعیم اور عظمیٰ نے ہمیشہ کی طرح سب سے آخر میں کھانا کھایا۔ اور اب باری تھی۔ جڑواں بہنوں (کھیر) کی۔ جو سارے راستے بڑی پریشان رہیں۔ اور بار بار مجھ سے یہ ہی شکوہ کرتی رہیں کہ آپ اتنی گرمی میں کہاں لے آئیں ہمیں۔ ایک تو ہمارے چہروں پر مسلسل دھوپ پڑ رہی ہے۔ اوپر سے گاڑی اتنی اچھل اچھل کر چل

یہ بھی کوئی مشورے کا وقت ہے

رہی ہے کہ ہماری تو پوری جان ہی اتھل پتھل ہو گئی ہے۔ اس گرمی اور راستے کی اچھل کود سے تو ہم شکل سے بے شکل ہو جائیں گے۔ اس بگڑی شکل کیساتھ ہم کیسے سامنا کریں گے سب کا۔ میں پورے راستے انہیں تسلیاں دیتی رہی کہ تم کیوں گھبراتی ہو۔ تمہارے چہروں پر نقاب پڑا ہوا ہے۔ دوسرے میں نے تمہیں سہارا دیا ہوا ہے۔ یہ اچھل کود اور گرمی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔ تم سب کو خوبصورت لگو گی اور پسند بھی آؤ گی۔۔اور ہوا بھی یہی۔۔ڈائننگ ہال میں جب ان کے چہروں سے نقاب ہٹے تو سب نے ان کی تعریف کی اور پسند کیا۔۔

الاقرباء کی ہر پکنک کا ایک مستقل فیچر

کھانے سے فارغ ہوئے ہی تھی کہ نماز ظہر کا وقت ہو گیا۔ علی بھائی نے بڑی خوبصورت آواز میں اذان دی اور سب کو نماز کی دعوت دی۔ تمام خواتین وحضرات نے نماز ادا کی۔ جناب ایم ایم شیخ صاحب نے امامت کے فرائض انجام دیئے۔ نماز ادا کر کے سب نے نعیم کے زیر اہتمام تیار کردہ مزیدار چائے کا لطف اٹھایا۔ اس کے بعد کچھ گروپ فوٹو بنائے گئے۔ اور ازاں بعد قافلہ کھیوڑہ مائنز کی سیر کیلئے روانہ ہو گیا۔
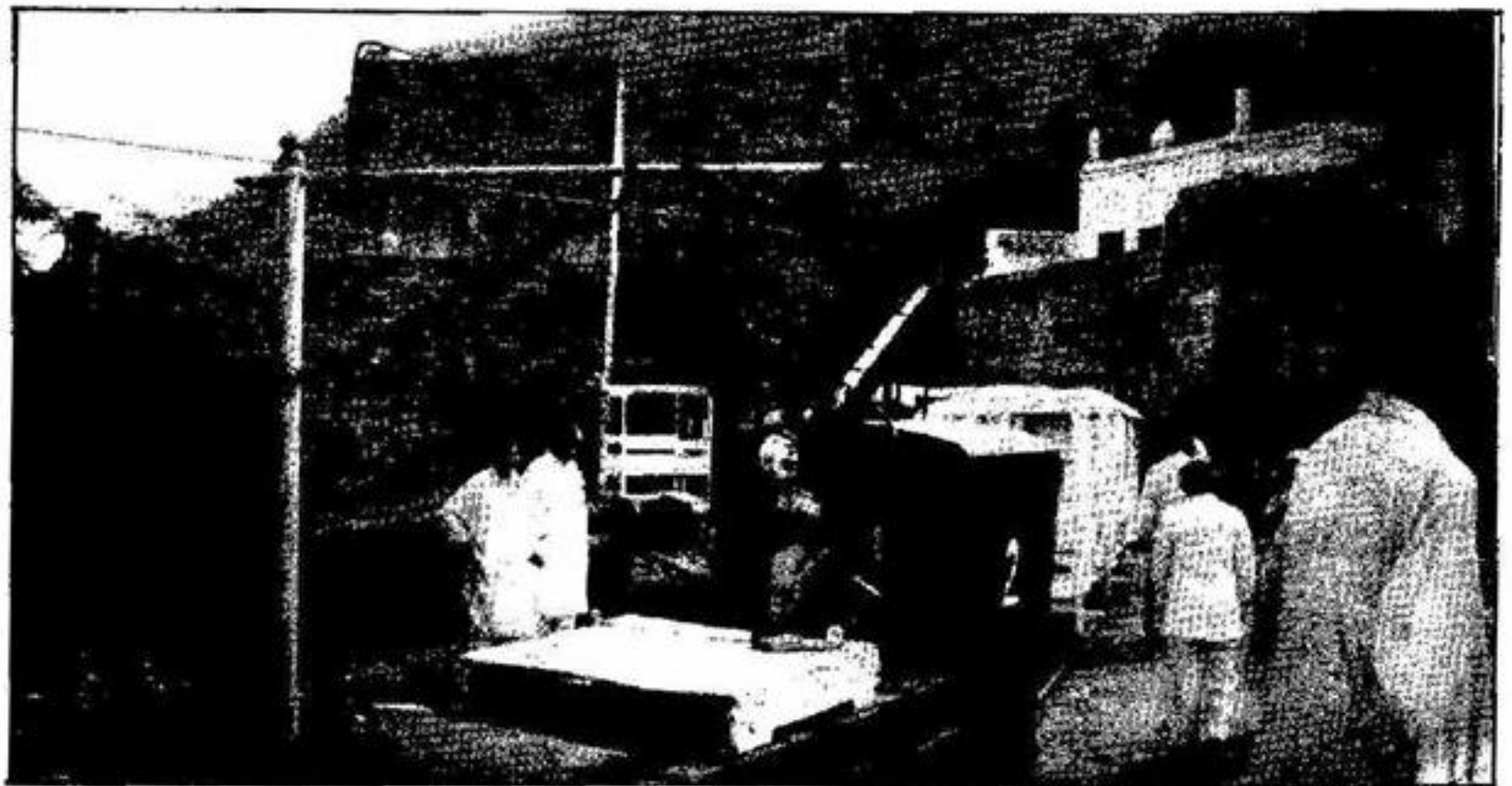
ٹرین میں لگانے کے لیے انجن لایا جارہا ہے

عام لوگ کام کے اوقات میں بھی کانوں کی سیر کر سکتے ہیں۔تاہم اس کیلئے صبح ۱۰ بجے سے شام ۴ بجے تک کا وقت مقرر ہے۔اوپر جا کر کان میں داخلہ سے پہلے کافی بڑی جگہ گاڑیوں کی پارکنگ کیلئے مختص ہے۔ ہم سب نے جائے مقرر پر اپنی گاڑیاں پارک کیں۔اور انتظار گاہ کا رخ کیا۔یہ سفید رنگ کی صاف ستھری کشادہ عمارت ہے۔اس میں سیر کرنے والوں کیلئے نشست کا انتظام ہے۔پورے ہال میں صوفے لگے ہوئے ہیں۔اندر کی سجاوٹ بھی سفید و سنہری رنگ کی اشیاء سے کی گئی ہے۔چھٹی کا دن ہونے کی وجہ سے وہاں رش کافی تھا۔آرمی میڈیکل کالج کے طلباء کے علاوہ عام پبلک اور اسکول کے بچے بھی آے ہوئے تھے۔تاہم ہم لوگوں کو زیادہ پریشانی اس لئے نہیں ہوئی کہ جناب جی اے صابری کی وساطت سے پہلے ہی تمام انتظامات کرالئے گئے تھے۔۔منصور بھائی بحیثیت صدر الاقرباء فاؤنڈیشن وہاں کے منتظم اعلیٰ جناب زاہد حسین سے ملے انہوں نے ہم سب کو نہایت عزت واحترام سے انتظار گاہ میں بٹھایا۔کان کی سیر ایک ٹرین کے ذریعہ جو مختلف ٹرالیوں پر مشتمل ہوتی ہے کرائی جاتی ہے۔جس کیلئے معمولی ٹکٹ ہے۔جو ہم سے نہیں لیا گیا کہ ہم بحیثیت مہمان وہاں کی سیر کر رہے تھے۔

ٹرین میں ابھی کچھ دیر تھی لہٰذا ہم نے وہاں پر موجود ایک گفٹ سنٹر کی بھی سیر کی۔وہاں پر نمک سے تیار کردہ بہت سی سجاوٹی اشیاء ملتی ہیں۔وہ اشیاء اتنی مہارت سے بنائی گئی ہیں کہ جب تک انہیں چکھا نہ جائے وہ نمک کی بنی ہوئی نہیں لگتیں۔وہیں کولڈ ڈرنکس وغیرہ کی دکان اور ایک ریسٹورنٹ بھی ہے۔تقریباً بیس پچیس منٹ کے انتظار کے بعد ہمیں ٹرین لگنے کی اطلاع ملی تو ہم اس طرف چلے گئے۔جب تمام ٹرالیاں آپس میں

ایک سوچ۔۔۔اس کے بعد کیا ہوگا

ٹیبل ٹینس یا چائے کا شغل

جوڑلی گئیں تو ہمیں اس میں بیٹھنے کا اشارہ ملا۔ تمام لوگ جلدی جلدی ٹرین میں بیٹھنے لگے کہ ٹرین ایک دم چل گئی آدھے لوگ ابھی نیچے ہی کھڑے تھے۔ گائیڈ نے ہمیں رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ ٹرین ذرا آگے جا کر رک گئی تو اس کے پیچھے کچھ اور ٹرالیاں جوڑی گئیں۔ جن میں بقیہ لوگ بیٹھے۔ نعیم یہاں بھی بھاگ دوڑ کرتے نظر آرہے تھے۔ اطہر اور ہانی بھی ابھی باہر تھے۔ آخران لوگوں کو بھی جگہ مل گئی اور وہ ٹرین میں بیٹھ گئے۔ ہماری ٹرالی میں شیخ صاحب، نجمہ، آفتاب بھائی، طیبہ بھابی، مریم، رمان اور میں تھے۔ اطہر بھی اتفاق سے وہیں آگئے۔ ہم سب نے مل کر آفتاب بھائی کی بڑی کھچائی کی کہ وہ طیبہ بھابی کو پلیٹ فارم پر بھی چھوڑ کر ٹرالی میں اکیلے ہی آبیٹھے تھے۔ ہم نے ان کے ساتھ واپسی میں ایسا ہی سلوک کرنے کی دھمکی دی تو وہ زور سے ہنس دیئے۔۔۔ ابھی یہ مذاق چل ہی رہا تھا کہ ٹرین ایک زوردار جھٹکے سے چل پڑی۔۔۔ سب کی چیخیں نکل گئیں۔ اور منزل مقصود پہ پہنچنے تک یہ چیخیں بار بار دہرائی جاتی رہیں کہ بریک لگتا ہی اتنے خطرناک انداز سے تھا۔۔ تاہم ٹرین کا یہ سفر بڑا ہی دلچسپ تھا۔ نوجوان اور بچے تمام راستے عجیب وغریب آوازیں نکال کر اظہار مسرت کرتے رہے۔۔۔

کان میں داخل ہوتے ہی ہمیں احساس ہوا کہ ہم ایک ایسی لمبی سرنگ میں سے گزر رہے ہیں جو مسلسل نیچے کی طرف جا رہی ہے۔ ہمارے سروں پر بلبوں کی ایک لمبی قطار سے مدہم مدہم روشنیاں پھوٹ رہی تھیں۔ جیسے جیسے ٹرین کان کے اندر آگے بڑھتی ہمیں احساس ہوتا کہ وہاں تو ایک دنیا آباد ہے۔ ہر طرف روشنیاں لگی ہوئی ہیں جو یقیناً واپڈا کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ لیکن کیا ہی اچھا ہوتا اگر یہ کام حفاظتی نکتہ کو ملحوظ رکھتے

ہوئے زیادہ سلیقے سے زیادہ احتیاطی تدابیر کے ساتھ انجام دیا جاتا۔ اور سرنگ کے دونوں طرف اور سر کے اوپر نمک کی دیواروں سے چمٹے ہوئے بجلی کے ننگے تار حفاظتی پائپوں کے اندر سے گزارے جاتے۔ تاکہ پیدل اور ٹرین کے ذریعے اندر جانے والوں کو گائیڈ کے "ذراہٹ کے، ذرا بچ کے" جیسے جملے نہ سننے پڑتے اور لوگوں کی جانوں کو خطرے کے امکانات نہ ہوتے۔

ہمارے گائیڈ نے ہمیں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ کی سیر میں ۲۵۰۰ فٹ علاقہ دکھایا۔ کان میں ہر چیز نمک کی ہے۔ بڑے محراب نما کمرے۔ ان کے ستون۔ ان کی دیواریں۔ فرش اور چھتیں سب ہی نمک کی ہیں۔ جدھر نگاہ اٹھتی نمک ہی نمک نظر آتا۔ بقول گائیڈ "یہاں آپ کے چاروں طرف نمک ہے۔ اس کو آپ یوں سمجھیں کہ گھروں میں نمک آپ کے پیٹ سے گزرتا ہے جبکہ یہاں آپ نمک کے پیٹ سے گزر رہے ہیں"
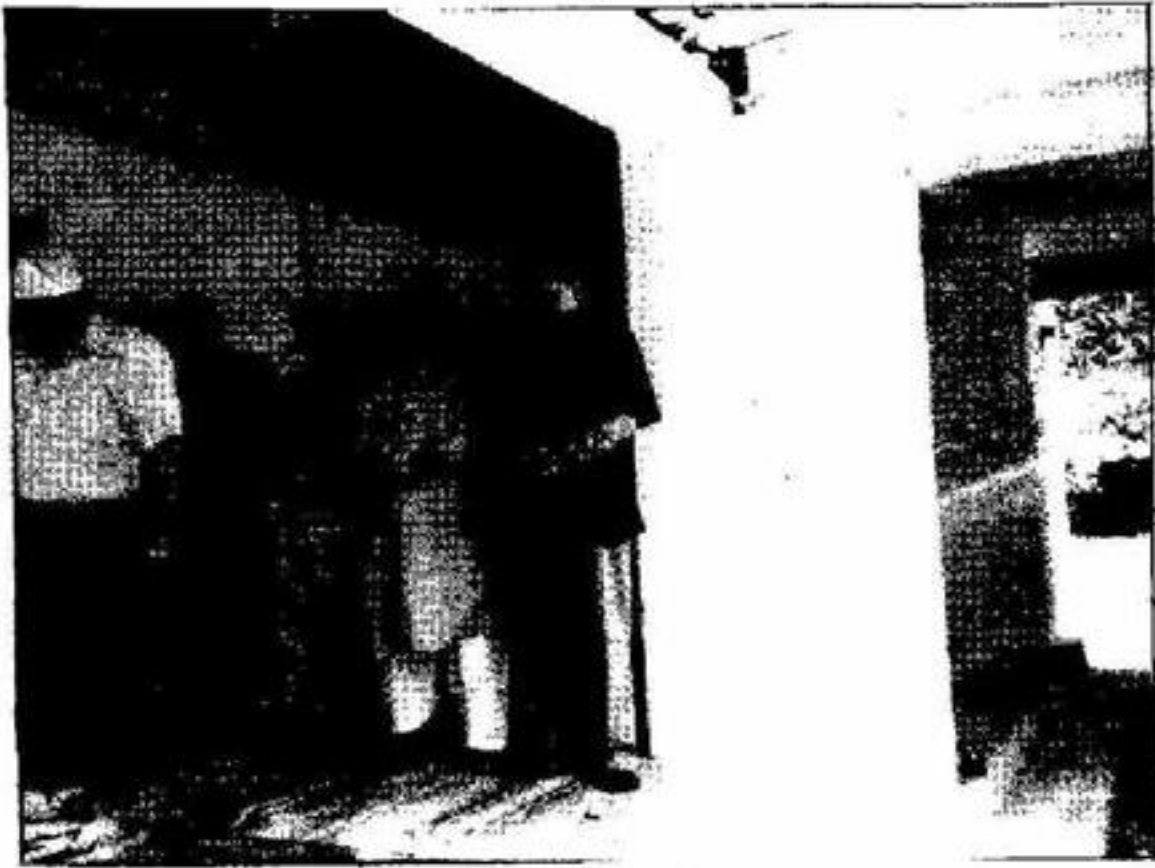
نماز ظہر

ٹرین سے اتر کر ہم نے سب سے پہلی جو چیز دیکھی وہ نمک کی خوبصورت سی مسجد ہے۔ جس کی تعمیر نمک کی رنگ برنگی نفاست سے تراشی ہوئی اینٹوں سے ہوئی ہے۔ سرخ و سنہری اور سفید رنگ کی اینٹوں سے قوس و قزح کے رنگ پھوٹتے ہیں۔ یہ خوبصورت مسجد پچاس سال میں مکمل ہوئی۔ اور یہ ہمارے اپنے محنت کشوں اور ہنرمندوں کا ذوق کمال ہے۔ اس مسجد میں قالین کی صفیں ہیں۔ اور اس میں باقاعدہ نماز ادا کی جاتی ہے۔

مسجد سے آگے "مال روڈ" ہے۔ جس کی لمبائی ۶۰ فٹ ہے۔ مال روڈ کے ایک طرف دیواروں سے نمک کے پانی کی بوندیں ٹپکتی رہتی ہیں۔ ہمارے گائیڈ عابد حسین نے بتایا کہ یہ آب حیات ہے اس کو جو پی لے

اس کی عمر سو سال بڑھ جاتی ہے۔ کچھ لوگوں نے کوشش کی لیکن ایک بوند بھی حلق میں کیا زبان پر بھی نہ رکھ سکے۔ آگے "شملہ پہاڑی" ہے۔ جو مسلسل ساٹھ سال تک نمک کے قطرے گر گر کر جم جانے سے وجود میں آئی ہے۔

گائیڈ عابد حسین نہایت ہی پھرتیلا اور گفتگو کا ماہر تھا۔ پوری کان کی ہسٹری اسے ازبر ہے۔ انداز تکلم متاثر کرنے والا اور پر اعتماد تھا۔ ہر جگہ کے بارے میں اس کی اپنی داستان و تاریخ ہے۔ چنانچہ کان کی تاریخ بتاتے ہوئے اس نے کہا کہ اس وقت جہاں ہم کھڑے ہیں یہ "اسمبلی ہال" ہے۔ یہاں مزدوروں کی میٹنگز ہوتی ہیں۔ یہ دنیا کا واحد اسمبلی ہال ہے جس کی تعمیر اوپر کی طرف سے شروع ہوئی۔ جس کا آغاز مغلیہ دور میں ہوا۔ اوپر پانچ منزلیں ہیں۔ ہر منزل کی سیڑھیوں پر بلبوں کی جھالر روشن ہے۔ ہر منزل کی اونچائی ۲۰۰ فٹ ہے۔ ۳۰۰ سیڑھیا ہیں۔ ہر کمرہ کی کٹائی ۷۰ سال میں مکمل ہوئی۔ اسمبلی ہال ۲۵۰۰ فٹ کی گہرائی میں ہے جبکہ اس کے نیچے گیارہ منزلیں اور ہیں

مسجد کے پاس ہی دو چھوٹے مینار ہیں جو نمک کے قطرے ٹپکنے سے وجود میں آئے ہیں۔ اور مسلسل ۵۰ سالوں سے یہ عمل جاری ہے

اس کے بارے میں عابد نے ایک اور کہانی سنائی کہ ایک مرتبہ اردو کے مشہور شاعر جناب احسان دانش لاہور سے یہاں تشریف لائے تھے تو انہوں نے ان میناروں پر گرتے قطروں کو مختلف نام دیئے۔ جو بڑے رومانوی ہیں۔ چھت سے ٹپکنے والے پہلے قطرہ کا نام بقول ان کے "اشک نمک"۔ دوسرے کا آہ نمک جہاں قطرے مل جائیں تو 'وصال نمک' اور جہاں الگ الگ گریں وہ "فراق نمک" ہے۔

نمک کی کان میں لے جانے والی ٹرین کا انتظار

آگے ''تھیا گلی'' تھی۔ وہاں سے آگے ''نہر سوئز'' ہے۔ جی ہاں آپ ٹھیک سمجھے یہ نمک کے پانی کا تالاب ہے جو پانی کے مسلسل رسنے سے بنا ہے۔ اور بہت سے تالاب وہاں راہداریوں کے اردگرد ہیں۔ جن کو گائیڈ نے اپنے حساب سے الگ الگ نام دیئے ہوئے ہیں۔ ''نہر سوئز'' سے گائیڈ ہمیں "Wish Point" پر لے گیا۔ وہاں ایک محراب نما کھڑکی ہے۔ گائیڈ نے کہا آپ اس کھڑکی میں پتھر پھینکیں جس کا پتھر پار ہو جائے گا اس کی دلی مراد پوری ہو جائے گی۔ یہ سننا تھا کہ سب لائن میں لگ گئے۔ جس کا پتھر پار ہو جاتا وہ خوشی کا زور دار نعرہ لگاتا۔ ابھی یہ شغل جاری ہی تھا کہ عابد حسین نے موٹروے کے راستے شیش محل چلنے کی دعوت دی لیکن اس سے پہلے سب کو رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ ''وش پوائنٹ'' وغیرہ کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ سب کام اللہ کی مرضی سے ہوتے ہیں۔ یہ تو وہ راستہ ہے جہاں سے ہم کانوں کی تمام گندگی باہر نکالتے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ سب کے منہ سے 'او۔ و۔ ڈ'' کی زوردار آواز نکلی اور ساتھ ہی سب کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔

آگے جا کر نمکین پانی کا بہت بڑا تالاب تھا جس کا نام گائیڈ نے ''بحر مردار'' بتایا یہ ہی وہ پانی ہے جو

نمک کی کان کی ٹرین کے مسافر

ICI کو سپلائی کیا جاتا ہے۔ یہیں سوز و واٹر پارک ہے۔ ان تمام نہروں اور سمندروں کے گرد حفاظتی جنگلے لگے ہوئے ہیں۔ پھر بھی پانی کے اندر جھانکتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔

یہاں سے گائیڈ کی رہنمائی میں ہم ''شیش محل'' پہنچے۔ لیکن اس سے پہلے ہمیں ''پل سراط'' عبور کرنا پڑا۔ جو پانی کے تالاب پر پتلا سا غیر محفوظ سا پل ہے۔ اسی لئے اسے پل سراط کہا ہے۔ اس سے آگے دائیں

نمک کے پتھروں سے بنائی گئی مسجد کا احاطہ

طرف ''دیوار چین'' ہے جسے زبان سے چاٹنے سے زندگی بڑھتی ہے۔ جبکہ بائیں طرف کی دیوار محبت چاٹنے سے محبت میں کامیابی ہوتی ہے۔ عابد بے تکان بولے جا رہا تھا۔ لفظوں کا ایک سیلاب ہے اس کے پاس جو اُمڈا چلا آتا ہے۔ اور زبان ذرا بھی لکنت نہیں کھاتی۔ ہر جگہ پر تبصرہ وہ اتنی سنجیدگی اور وثوق سے کرتا ہے کہ یہ سب حقیقت لگنے لگتی ہے جبکہ اصل میں ایسا نہیں ہے اپنے دعوے کی سچائی کے ثبوت کے طور پر اس نے کہا کہ آپ ان دیواروں کو چھو کر دیکھیں کتنی چکنی ہیں۔ یہ دراصل کالج کے لڑکوں لڑکیوں نے ہی چاٹ چاٹ کر کی ہیں۔ یہ سن کر سب کے منہ سے بے ساختہ قہقہے ابل پڑے۔ ان دیواروں سے آگے ''شیش محل'' ہے۔ اندر چاروں طرف روشنیاں لگی ہوئی ہیں۔ وہ نمک پر پڑتی ہیں تو اس سے دھنک کے رنگ پھوٹ نکلتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی دیواریں اور چھت پر ہیرے ہی ہیرے جڑے ہوئے ہیں۔ یہاں کی سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس کی دائیں طرف والی دیوار پر ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کی شبیہہ ہے جو قدرتی ہے ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے ہاتھوں سے یہ پینٹنگ بنائی ہے۔ اور یہیں سامنے والی دیوار پر ''مینار پاکستان'' بنا ہوا ہے جو واقعی ناقابل یقین ہے۔ لیکن حقیقت جھٹلائی نہیں جا سکتی۔

''شیش محل'' کے عین وسط میں جھیل ''سیف الملوک'' ہے۔ جس کی گہرائی ۱۰۰ فٹ اور لمبائی ۱۵۰ فٹ ہے۔ شیش محل کی روشنی اور نمک سے پھوٹتی رنگ برنگی کرنوں کا عکس جب اس کے پانی پر پڑتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے جھلمل کرتے ان گنت ستارے پانی میں اتر آئے ہیں اور ہر طرف نور و روشنی کا ایک سمندر موجزن ہے۔

''شیش محل'' سے باہر نکلے تو اس کے بائیں طرف ''انارکلی'' بازار تھا۔ وہاں کا منظر بھی بڑا دلکش تھا۔
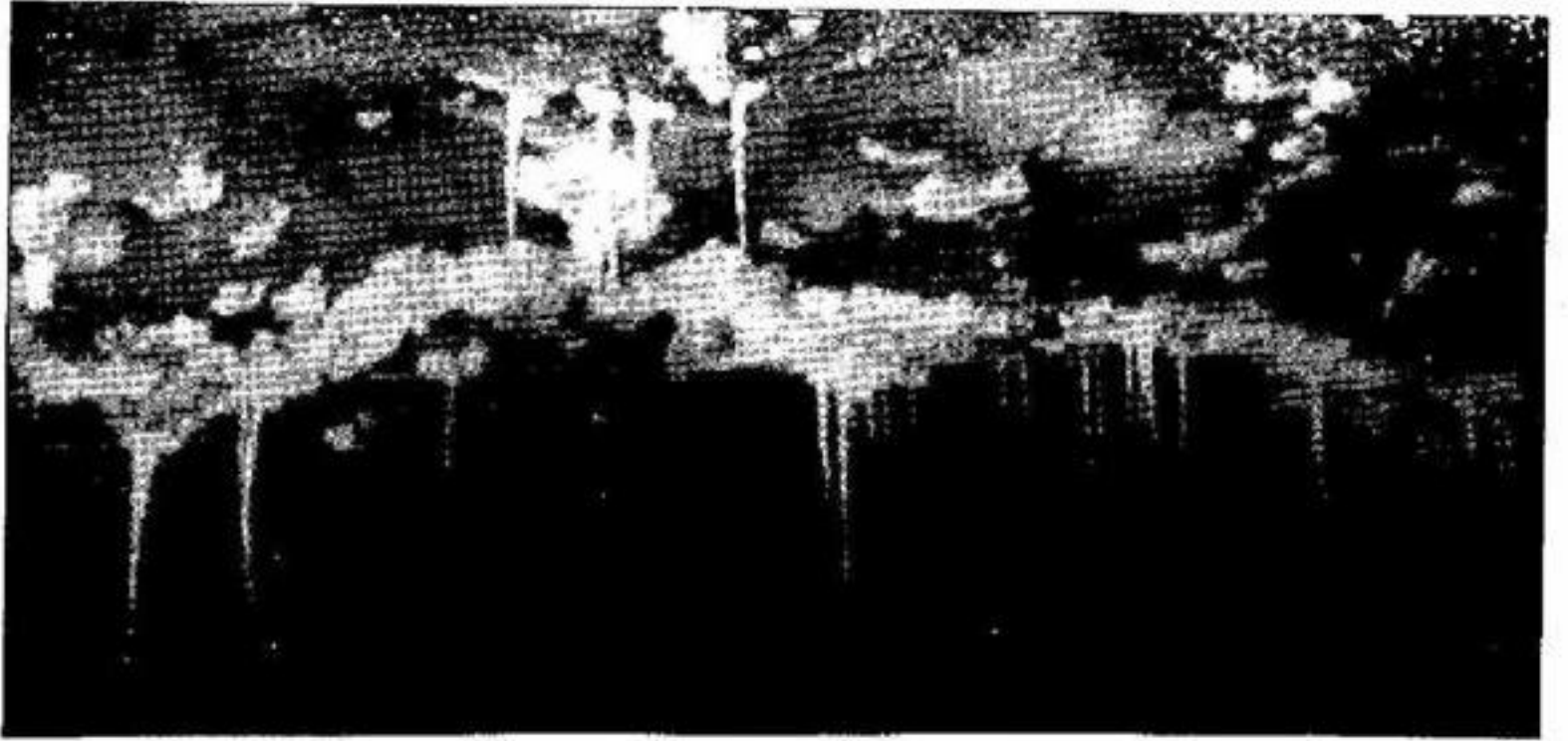
کان میں نمک کے پانی کے ٹپکنے سے بننے والے خوبصورت کرسٹل

روشنیوں میں ہیرے چمکتے نظر آرہے تھے۔ایسا سماں تھا جیسے یہاں ہیرے جواہرات فروخت ہوتے ہیں۔غرض یہ کہ کھیوڑہ شہر اور کھیوڑہ سالٹ مائنز قدرتی حسن اور عجائبات کا ایسا خزانہ ہیں جسے دیکھ کر عقل حیران اور آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔نمک کے وسیع و عریض کمروں کی چھتوں سے لٹکی ہوئی نمک کی لمبی لمبی جھالریں بجلی کی روشنی میں ایسے جھلملاتی ہیں جیسے وہاں ہزاروں فانوس آویزاں ہیں دوسری طرف نمکین پانی کے قدرتی تالاب ہیں جن کو دیکھ کر ہی ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔سوئے اتفاق اگر یہاں کسی کو پیاس لگ جائے تو پانی کے یہ بڑے بڑے تالاب اس کے کسی کام کے نہیں۔۔۔بلکہ صورت حال کچھ یوں بن جائے گی کہ

"Water , Water all around, but not a drop to drink---"

''شیش محل'' اور ''انار کلی'' سے باہر آئیں تو سامنے ایک ریسٹورنٹ ہے۔ جہاں ٹھنڈے مشروبات اور چائے کے علاوہ کھانے پینے کی دوسری اشیاء بھی ملتی ہیں۔سیر کو آنے والے کچھ دیر یہاں بیٹھ کر خود کو پھر سے تازہ دم کرنے کا سامان کرتے ہیں۔

سالٹ مائنز کا درجہ حرارت ہمیشہ ایک سا یعنی ۱۸ ڈگری سینٹی گریڈ رہتا ہے۔گرمیوں میں یہاں گرمی اور سردیوں میں سردی محسوس نہیں ہوتی۔ یہاں تقریباً بارہ مقامات پر بڑے بڑے **Exhaust Fan** لگے ہوئے ہیں۔جن سے موسم معتدل رہتا ہے۔اور اندر کسی قسم کی گھٹن محسوس نہیں ہوتی۔

کانوں کی سیر کے دوران ہمیں بتایا گیا کہ کان سے نمک نکالنا بڑا جان جوکھوں کا کام ہے۔پہلے بارود سے نمک کے پہاڑ توڑے جاتے ہیں اور ان بڑے بڑے ٹکڑوں کو مزدور ہتھوڑوں سے مزید توڑتے ہیں

غار کے اندر جانے کا راستہ

اور پھر ریل گاڑی اور ٹرام پر رکھ کر کان سے باہر لاتے ہیں۔

کھیوڑہ سالٹ مائنز کی یہ سیر اتنی دلچسپ تھی کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ سیر کے دوران نعیم سلمان اور دیگر حضرات نے وہاں کے اہم مقامات اور حسین مناظر کی عکس بندی کر کے ہمیشہ کیلئے محفوظ کر لئے۔ وقت کا سفر جاری تھا۔ اب ہم سیر کیلئے متعین حدود کے اختتام پر پہنچ چکے تھے۔ گائیڈ نے واپسی کا بگل بجایا اور ہم ایک بار پھر اس خوبصورت ٹرالی ٹرین میں بیٹھے اس کی ہل جل اور جھٹکے دار بریکوں کا لطف اٹھا رہے تھے۔ ٹرین کا کان سے باہر نکلنا تھا کہ سورج کی تیز روشنی نے ہمارا استقبال کیا اور ہماری آنکھیں چندھیا گئیں۔ لیکن یہ صورت حال چند ہی لمحوں تک رہی۔ اب ہم آسانی سے ہر چیز دیکھ رہے تھے۔ کان کے باہر بھی نمک کے بڑے بڑے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ وہاں نمک سے تراشیدہ اشیاء لئے بیٹھے تھے۔

آہستہ آہستہ شام کے سائے لمبے ہو رہے تھے۔ پانچ بجا چاہتے تھے۔ لٰہذا نہ چاہتے ہوئے بھی اس سحر انگیز ماحول اور دلکش فضاء سے روانگی کا قصد کرنا پڑا۔ پارکنگ میں پہنچ کر سب نے ہنستے مسکراتے چہروں کے ساتھ ایک دوسرے کو اللہ حافظ کہا اور اپنے اپنے آشیانوں کی طرف پرواز کر گئے۔

دھوپ کی تمازت، طویل مسافت اور ناہموار و دشوار راستے بھی اس دورے کے حسن و دلکشی کو کم نہ کر سکے۔ بلاشبہ یہ ہر لحاظ سے ایک کامیاب دورہ تھا۔ یہاں کا ہر سین یہ ہی کہتا محسوس ہوتا تھا۔

"کھول آنکھ زمین دیکھ، فلک دیکھ، فضاء دیکھ"

سید محمد احسن شارز

# غزل

جسم اور روح کو بیچ دیا
کچھ توڑے ، بت کچھ سجا لیئے

تھام کے دل ، آئینے کو
شکوے سارے سنا لیئے

بیری دنیا ، دشمن دنیا
ہم نے سب غم چھپا لیئے

دور جہانِ رنگ و بُو سے
ڈیرے ہم نے جما لیئے

پت جھڑ تھی یا ساون دیکھا
سُر تھے کچھ جو بجا لیئے

ہوش کی دنیا راس نہ آئی
میخانے بھر بسا لیئے

جینا بھی شارز تھا ضروری
کچھ پل ہم نے چرا لیئے

مرتبہ

بیگم طیبہ آفتاب

# ''گھریلو چٹکلے''

۱۔ **فریجیڈیئر استعمال نہ کرنا ہوتو:** سردیوں کے موسم میں فرج کی کچھ زیادہ ضرورت نہیں رہتی۔ اگر آپ اپنا فرج کچھ عرصہ کیلئے استعمال کرنا نہ چاہیں تو اس میں ایک پیالی سرکہ بھر کر رکھ دیں۔ فرج ہر قسم کی بو سے پاک رہے گا۔

۲۔ **کپڑوں اور بالوں سے چیونگم اتارنے کیلئے:** اکثر بچے چیونگم کھاتے ہوئے اپنے بالوں اور کپڑوں پر چپکا لیتے ہیں جو بڑا مسئلہ بن جاتی ہے۔ اس کیلئے آپ یہ کریں کہ برف کا ٹکڑا اس جگہ پر ملیں۔ چیونگم آسانی سے اتر جائے گی۔

۳۔ **عینک اور دھوپ کے چشموں سے نشانات صاف کرنے کیلئے:** اس کیلئے آپ چشمہ کے شیشوں پر ٹوتھ پیسٹ لگا کر سادے پانی سے دھولیں اور پھر ایک صاف اور نرم کپڑے سے انہیں خشک کر لیں۔ نشانات بالکل جاتے رہیں گے۔

۴۔ **جلد کو صاف وشفاف اور تروتازہ رکھنے کیلئے:** اس مقصد کیلئے انڈے کی زردی کو تھوڑے سے بادام کے تیل میں ملا کر آمیزہ سا بنا لیں اور اس کو جلد پر ملیں۔ اس سے جلد کے چھوٹے چھوٹے مسامات سے میل کھینچ کر باہر آجائے گا اور جلد کو ایک قسم کی غذائیت بھی ملے گی اور وہ شگفتہ وتروتازہ ہو جائے گی۔

۵۔ **چہرے کے مسام بھرنے کیلئے:** شہد کو گرم پانی میں ملا کر پگھلا لیں اور پھر اس محلول کو چہرہ پر لگائیں۔ مسام بھر جائیں گے۔

۶۔ **آنکھوں کے گرد سیاہ حلقوں کیلئے:** رات کو سوتے وقت دودھ آنکھوں کے گرد لگا کر سو جائیں اور صبح دھولیں۔ حلقے جاتے رہیں گے۔

۷۔ **رنگت نکھارنے اور جلد کی خوبصورتی کیلئے:** ٹماٹر کے ٹکڑے جلد اور چہرے پر رگڑنے سے رنگت نکھرتی ہے اور جلد خوبصورت ہو جاتی ہے۔

۸۔ **گرتے بالوں کیلئے:** ابلتے ہوئے پانی میں جوشاندہ آدھا اونس (1/2) ملا کر رات بھر رکھا رہنے دیں۔ صبح اسے نتھار کر ایک بوتل میں ڈال کر رکھ لیں۔ اور ایک ماہ تک روزانہ بالوں میں اس کی مالش کریں۔ گرتے بالوں کیلئے یہ نسخہ اکسیر ہے۔

۹۔ **چہرے سے دانے اور کیل دور کرنے کیلئے:** میتھی کے پتے پیس کر اس میں لیموں کا رس ملا کر چہرے پر لگانے سے کیل اور دانوں سے نجات مل جاتی ہے۔

۱۰۔ **ہونٹوں کی سیاہی دور کرنے کیلئے:** بالائی میں نمک ملا کر ہونٹوں پر لگانے سے ان کی سیاہی ختم ہو جاتی ہے

۱۱۔ **بال کالے کرنے کیلئے:** آلو کے ٹکڑے رات بھر کیلئے لوہے کی کڑاہی میں بھگو دیں۔ صبح اس پانی سے بال دھو لیں۔ کالے ہو جائیں گے۔

۱۲۔ **چہرے سے پھنسیاں، کیل مہاسے اور چھائیاں دور کرنے کیلئے:** لیموں کے چھلکے سکھا کر باریک پیس لیں اور عرق گلاب میں ملا کر چہرے پر ملیں۔ پھنسیاں، کیل، مہاسے اور چھائیاں جاتی رہیں گی اور رنگت بھی نکھر جائے گی۔

۱۳۔ **دانتوں سے سیاہ داغ دور کرنے کیلئے:** چنبیلی کے پتے تھوڑے سے پانی میں ابال لیں۔ اور پھر اس پانی سے صبح شام کلیاں کریں۔ چند ہی دنوں میں دانتوں سے سیاہ داغ ختم ہو جائیں گے۔

۱۴۔ **قالین کے رنگ اور چمک کو بہتر کرنے کیلئے:** ایسے قالین جو اپنا رنگ اور چمک کھو چکے ہوں۔ ان کو گرم پانی میں تارپین کا تیل ملا کر بھگو دیں اور پھر اچھی طرح مل لیں چمک آجائے گی۔

۱۵۔ **منی پلانٹ کیلئے:** منی پلانٹ کی مٹی میں اگر پیاز کے چھلکے ڈال دیئے جائیں تو پودا تیزی سے بڑھے گا۔

۱۶۔ **پینل اور شیشے کی سجاوٹی اشیاء صاف کرنے کیلئے:** سرکہ ایسی چیزیں صاف کرنے کیلئے ایک بہترین رقیق کلینر ہے۔

۱۷۔ **گولڈ پلیٹڈ ڈیکوریشن پیسز کیلئے:** ایسی سجاوٹی اشیاء کو کدو (Pumpkin) کے رس سے صاف کریں چمک جائیں گے۔

۱۸۔ **بالوں کو سیاہ کرنے کیلئے:** سیکا کائی اور آملہ (کسی بھی پنساری کے یہاں سے مل جائیں گے) کوٹ کر رات بھر کیلئے کسی لوہے کے برتن میں بھگو دیں اور صبح ان کو باریک پیس لیں۔ اور اسے پندرہ منٹ کیلئے بالوں میں لگا لیں۔ اس کے بعد سر دھو لیں۔ چالیس دن تک یہ نسخہ دہراتے رہیں۔ سفید بال سیاہ ہو جائیں گے۔

Quarterly **AL-AQREBA** Islamabad

**ISLAMABAD REGISTERED No. 252**



**A literary, academic, educational & socio-cultural magazine of Al-Aqreba Foundation, Islamabad.**

**House # 464, Street 58, I-8/3, Islamabad.**